BIHAR URDU ACADEMY

نومبر ۲۰۲۳ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

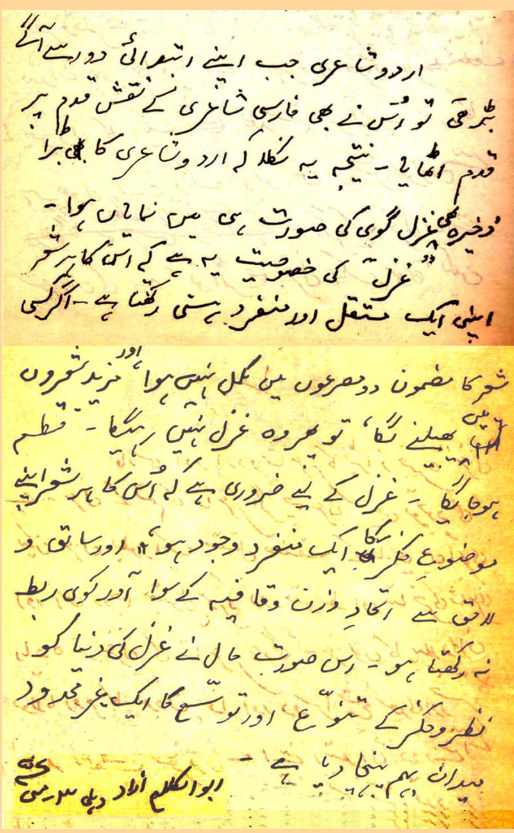

اردو شاعری جب اپنے ابتدائی دور سے آگے
بڑھی تو اس نے بھی فارسی شاعری کے نقش قدم پر
قدم اٹھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اردو شاعری کا بڑا
ذخیرہ بھی غزل گوئی کی صورت ہی میں نمایاں ہوا۔
غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر
اپنی ایک مستقل اور منفرد ہستی رکھتا ہے۔ اگر کسی
شعر کا مضمون دو مصرعوں میں مکمل نہیں ہوا اور مزید شعروں
میں پھیلنے لگا، تو پھر وہ غزل نہیں رہیگا۔ قطعہ
ہو جائیگا۔ غزل کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ہر شعر اپنے
موضوع فکر کا ایک منفرد وجود ہو۔ اور سابق و
لاحق سے اتحادِ وزن و قافیہ کے سوا اور کوئی ربط
نہ رکھتا ہو۔ اس صورت حال نے غزل کی دنیا کو
نظر و فکر کے تنوع اور توسع کا ایک غیر محدود
میدان بہم پہنچا دیا ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلی ۳ مئی

زر

زَر ، یہ صدا بھی رکھتی ہے کیا سحر کا اثر
قائم جہان کا ہے تجھی سے طلسم زر
دھومیں مچی ہوئی ہیں یہ تیری ہی دیس دیس
ڈنکا بجا ہوا ہے ترا ہی نگر نگر
بازار میں گئے تو وہاں بھی ہے تیری یاد
تیرا ہی ذکرِ خیر ہے واں سے جو آئے گھر
خوبی کو تیری چاہئے کیا قیدِ امکنہ
کانوں میں تو ہے خوب ، مکانوں میں خوبتر
خوش خلق تیرے قہر سے مشہور کج نہاد
کج خلق تیری مہر سے مشہور خوش سیَر
ہر ایک کل میں تیرے ہی پرزے ہیں کام کے
کاریگری تجھی سے اس درجہ کار گر
سمجھایا منطقی نے ہے یہ مجھ کو کلیہ
خالی طمع سے زر کے نہیں ایک بھی بشر
ایمان کی جو پوچھو تو شہبازؔ کے بقول
مرتے ہیں تجھ پہ ہم بھی و لیکن نہ اس قدر
ہر چند تو خدا تو نہیں پر خدا گواہ
بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عبدالغفور شہبازؔ

عبدالغفور شہبازؔ بہار کے ایک معزز سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے والد کا نام طالب علی تھا۔ شہبازؔ نے اپنی نانیہال قصبہ سیرمیرا، باڑھ ضلع پٹنہ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ شہبازؔ کا سال ولادت کہیں ۱۸۵۵ء اور کہیں ۱۸۶۰ء لکھا ہے جب کہ پچاس سال کی عمر میں رحلت کے حساب سے یہ ۱۸۵۸ء ہوتا ہے۔ شہبازؔ کی علمی خدمات کا دائرہ ''دارالسلطنت'' کلکتہ کی ادارت اور اورنگ آباد کالج، دکن میں علم طبعیات کی پروفیسری سے ناظم تعلیمات ریاست بھوپال کے منصب عالیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ ''رباعیات شہبازؔ''، ''خیالات شہبازؔ''، ''تفریح القلوب'' اور ''باقیات شہبازؔ'' نامی مجموعہ ہائے کلام کے علاوہ ''کلیات نظیر''، ''خیالات آزاد''، ''موعظہ حسنہ''، ''مقالات جمالیہ''، ''سوانح عمری مولانا آزاد'' اور ''نوابی دربار'' ان کی نثری تالیفات ہیں اور ''زندگانیٔ بے نظیر'' ان کی مشہور و معروف نثری تصنیف جو ۱۹۰۰ء میں چھپی تھی۔ شہبازؔ کا انتقال ۲۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو کلکتہ میں ہوا اور وہیں نواب سید محمد آزاد کے خاندانی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

BIHAR URDU ACADEMY

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر
ابرار احمد خان
سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر
انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۴ شمارہ : ۱۱
نومبر ۲۰۲۳ء

زرتعاون : پندرہ روپے
سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ: سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476
Web : www.biharurduacademy.in
email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی
تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمد خان		۳
مقالات	مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت گوئی	علیم صبانویدی		۴
	افسانہ ''گرہن'' کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر پرویز شہریار		۷
	بصیرت وعبرت کا شعری پیکر: سرائے فانی	ڈاکٹر عطا عابدی		۱۴
	غزلیات اقبال: ارتقائی مراحل وخصوصیات	ابوالبرکات شاذ قاسمی		۱۶
	واقف عظیم آبادی اور واقف آرٹ	فخرالدین عارفی		۱۸
	آزادی کے بعد اردو شاعری پر جدیدیت کے اثرات	ڈاکٹر ندیم احمد		۲۰
	عرفان صدیقی: ایک شاعر، ایک مترجم	ڈاکٹر محمد ثاقب انور		۲۴
	مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی بصیرت	محمد ثناءاللہ		۲۶
	نیاز فتح پوری: ایک عظیم صحافی	سعدیہ بانو		۲۹
عروضیات	تسکین اوسط اور تخنیق کے رموز	ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم		۳۱
افسانے	معدوم ہوتی روشنی	سیّد احمد قادری		۳۵
	ریت کی دیواریں	محمد طارق		۳۸
	مین ہول	اسلم سلازار		۴۰
طنزومزاح	بڑھاپا نامہ	جہانگیر انس		۴۲
منظومات	بڑی شان والا ہے ربِّ قدیر	ایم۔ایچ۔تابش رُدولوی		۴۶
	نعت اقدس	ذاکرہ شبنم / رابعہ نوری		۴۷
	چار نظمیں	سلطان احمد ساحل		۴۸
	مشق سخن / تھوڑی سی مہلت	شکیل اختر / نیلوفر پروین		۴۹
	غزلیں	اعجاز مانپوری / آزاد سونی پتی		۵۰
	غزلیں	فہیم سہسرامی		۵۱
	غزل	توقیر عالم توقیر		۵۲
	غزلیں	زویا شاہین		۵۳
	غزلیں	مشتاق سیوانی		۵۴
	غزل / قطعات	منور داناپوری / حافظ محمد تمنا		۵۵
کتابوں کی دنیا	بنت فنون کا رشتہ	بدر محمدی	مبصر : شکیل سہسرامی	۵۶
	ذکر حیات......	محمد شکیل استھانوی	مبصر : ڈاکٹر ممتاز فرخ	۶۱
	عطا عابدی اور ادب اطفال	ڈاکٹر منور راہی	مبصر : ایم۔احمد توصیف	۶۳
وفیات	شارب ردولوی چل بسے	ادارہ		۶۶
سلام وپیام	ڈاکٹر انجمن اختر، احمد گلریز، ایم۔ارفاق، پیکر رضوی، شرف الہدیٰ، صادق علی انصاری، ادیبہ حیات شفا			۶۹

بچوں کا زبان وادب ۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب''میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

☆ عکوس تحریر سرورق وپس ورق ماخوذ بہ شکریہ گلستانِ ہزار رنگ، مولفہ سید بہاالدین احمد، ۱۹۷۱ء اور ''آواز'' نئی دہلی، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء

ادا ریہ

حرف آغاز

عنایت ربّ ذوالجلال کی ـــــــ ’’زبان وادب‘‘ کا تازہ شمارہ آپ کی نذر ہورہا ہے۔اس شمارے کے مقالوں کا آغاز اُس تحریر سے ہے جس میں نہایت جامع تمہیدی بیان کے ساتھ ’’مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت گوئی‘‘ کے نمایاں پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔ بعدازیں یہاں دومقالے عملی تنقید سے اپنا رشتہ بناتے ہیں جن میں متنی اقتباسات اور تنقیدی حوالوں کے ساتھ بالترتیب بیدی کے افسانہ ’’گرہن‘‘ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور شوقؔ لکھنوی کی نظم ’’سرائے فانی‘‘ کا بصیرت وعبرت کے شعری پیکر کی حیثیت سے پراثر اور جامع تذکرہ ہوا ہے۔علاوہ ازیں اس حصہ میں کہیں ’’علامہ واقفؔ عظیم آبادی اور واقف آرٹ‘‘ کے بارے میں تفہیمی وتشریحی انداز سے گفتگو کی گئی ہے،کہیں سوانحی اور تجزیاتی اشاروں کے ساتھ ’’عرفان صدیقی:ایک شاعر،ایک مترجم‘‘ کی حیثیت سے سامنے لائے گئے اور کہیں رسالہ ’’نگار‘‘ کے خصوصی نمبرات کی روشنی ’’نیاز فتح پوری:ایک عظیم صحافی‘‘ کی حیثیت سے یاد کئے گئے ہیں اور کہیں مناسب ادبی منظر وپس منظر اور متنوع تحولاتی نکات کے ساتھ ’’آزادی کے بعد اردو شاعری پر جدیدیت کے اثرات‘‘ دکھائے گئے ہیں۔

نومبر کا مہینہ علامہ اقبالؔ اور مولانا آزاد کی ولادت کا مہینہ ہے،اس مناسبت سے یہاں ’’غزلیات اقبالؔ: ارتقائی مراحل وخصوصیات‘‘ کے عنوان سے حسب موضوع نہایت ہی واضح تجزیاتی بیانات آئے ہیں اور متنوع جہتوں سے ’’مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی بصیرت‘‘ آئینہ کی گئی ہے۔بعدازیں ’’عروضیات‘‘ کے تحت فن شاعری کی دو اہم اصطلاحوں پر نہایت نفیس انداز سے تکنیکی نکات ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

یہاں ’’افسانے‘‘ کا سلسلہ صوتی آلودگی پر ذہن ساز کہانی ’’معدوم ہوتی روشنی‘‘ سے شروع ہورہا ہے،جس میں ماضی کے ماحول کی جھلک بھی ہے،مذہبی عقیدے کا پٹ بھی اور بچوں کو نصیحت کے پردے میں بڑوں کی ذہنی وعملی اصلاح کا نہایت خوبصورت اور موثر فنی وطیرہ بھی،جب کہ زندگی کی ایک سفاک حقیقت دکھا جانے والے پراثر کلائمکس پر مبنی کہانی میں ’’ریت کی دیواریں‘‘ جب گرتی ہیں تو جنازے کو کاندھا دینے والے کرداروں کی ذہنی قماش اچانک نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور ساتھ ہی فوزیہ جیسی سہیلی کا نہایت سطحی کردار اور صفیہ کے باپ کا انتہائی غمزدہ کردار بھی،پھر خاص بنت اور تہدار اشاراتی زبان میں لکھی گئی کہانی ’’مین ہول‘‘ میں خیالی پلاؤ سے زمینی حقیقت تک پھیلی ہوئی،گٹر کے ڈھکن چور شرابی کی نفسیات اور نفس مقصدیت بھی فن کے باریک حریری پردوں سے جھانکنے ہی لگتی ہے۔

امید واثق ہے کہ نہ صرف مقالے اور افسانے بلکہ اس شمارے کی طنزیہ ومزاحیہ تحریر ’’بڑھاپا نامہ‘‘ بھی حظ وانبساط کا باعث ہوگی۔متنوع اصناف سے مزین ’’منظومات‘‘ کا حصہ بھی پسند خاطر ہوگا۔تبصروں سے سجی سجائی ’’کتابوں کی دنیا‘‘ بھی پسند آئے گی اور پھر چاچا نہرو کے تذکرے،علامہ اقبالؔ کے سفر بہار پر معلوماتی اور دلچسپ تحریروں اور دیگر شعری ونثری تحفوں کے ساتھ ’’بچوں کا زبان وادب‘‘ پاکر ہمارے نونہال بھی یقیناً خوش ہوں گے۔

انہیں سطروں کے ساتھ آخر میں ڈاکٹر شاربؔ ردولوی کے انتقال پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے خدا حافظ،خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

مقالات

علیم صبانویدی

No. 192/266,Triplicane, High Road, Flat No.16, Second Floor,
Rice Mandi Street, Chennai - 600005

مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت گوئی

لفظ نعت کے لغوی معنی تعریف کے ہیں، مگر اصطلاح شاعری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا یا آپ کے اوصاف حمیدہ اور آپ سے دلی وابستگی کو بصد خلوص وعقیدت پیش کرنے کا نام ''نعت'' ہے۔ اردو ادب کے مشہور ومعروف محقق اور نقاد مدیر ''نگار'' کا بیان ہے کہ:

''نعت حضور اکرم کی ایسی ثنا خوانی ہے جو آپ کی ذاتی خصوصیات پر مشتمل ہو۔''

اگر ہم عہد نبوی کے نعت گو شعرا مثلاً حسان بن ثابت، حضرت کعب ابن زہیر، حضرت علی اور حضرت فاطمہ کی نعتوں کا مطالعہ کریں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی نعتوں میں خود اپنی حالت زار کا ذکر بھی ہے اور حضور اکرم سے استعانت کی درخواست بھی۔ حضرت کعب ابن زہیر کا ''قصیدۂ بانت سعاد'' نعت ہی کے روپ میں تھا، جس کو سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارکہ سے حضرت کعب ابن زہیر کو نوازا تھا۔ اس میں کعب ابن زہیر نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع واعلیٰ صفات اور خصوصیات کے روشن نقوش پیش کئے تھے۔

اردو ادب میں نعت گوئی کی تاریخ شاہد ہے کہ عربی زبان میں سب سے پہلے نعت شریف حضرت ابوطالب نے کہی تھی اور نعت گوئی کا سلسلہ عہد نبوی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس عہد کے نعت گو شعرا میں خلفائے راشدین اور حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان نعت گو شعرا کی نعتوں کا ذکر اور ان کا کلام ماہنامہ ''نقوش'' لاہور کے ''رسول نمبر'' میں موجود ہے۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید کا بیان ہے کہ:

''ہر اُمتی کو اپنے نبی پاک کی اطاعت واتباع کا پیکر ہونا چاہیے اور نعت شریف کہنے والوں کو دوسرے عام افراد کی نسبت اتباعِ رسول کی زیادہ پابندی کرنی چاہیے کیوں کہ وہ نعت رسول کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور اس دعویٰ کا اعلان بھی کرتا ہے تو اس کا اپنا ظاہر و باطن اس دعویٰ پر دلیل ہونا چاہیے، ورنہ یہ دعویٰ صرف زبانی کلام میں شمار ہوگا۔'' (''آداب نعت'' کراچی ۲۰۰۴ء ص ۱۹۴)

پروفیسر اقبال جاوید کے بیان اور دعویٰ کی ساری شہادتیں مندرجہ بالا شعرا میں نمایاں ہیں۔ مسرت اس بات کی ہے کہ عہد نبوی میں شاعر رسول حسان بن ثابت نے محبوب کبریا کے حسن ظاہری اور جمال باطنی کا ذکر اس خوبصورت انداز سے کیا ہے کہ قلم اور کاغذ مشک بار ہو گئے ہیں۔

عہد نبوی کا عظیم ترین عطیہ یہ ہے کہ شہنشاہِ عرب نے مدینہ منورہ کو ''طیبہ'' کے نام سے سرفراز کیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز گلبرگہ کے مقدس شہر کے ایک نعت گو شاعر وحید انجم کی آرزو طیبہ سے متعلق کیا ہے، دیکھئے ؎

مجھے زیارتِ طیبہ نصیب ہو جائے
قبول دل کی تمنا حبیب ہو جائے

محققین ادب نے نعت کا پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ معانی کو بتایا ہے، مگر سچائی یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ معانی سے بہت پہلے ہمیں عہد سلاطین بہمنی میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تخلیقات میں نعتیہ اشعار ملتے ہیں، جس کا ذکر ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنی کتاب ''انکشافات'' (مطبوعہ ۲۰۱۲ء) میں کیا ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بعد جہاں عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی اور برید شاہی دور کے شعرا نے نعت نویسی کی طرف خاص توجہ دی، وہیں عہد والا جاہی کے شعرا میں شاہ تراب ترنا ملی، ولی ویلوری، قربی ویلوری، نامی آرکاٹی، آشفتہ آرکاٹی، مذنب آرکاٹی،

امانی پلی کنڈوی، فرحت ترچنا پلوی، نواب مبشر النسا حیا آرکاٹی، عاجزہ ترچنا پلوی نے اپنے اپنے مجموعوں میں نعتیں پیش کی ہیں، جن میں رسول پاک سے ان کی قلبی اور روحانی وابستگی کا پرنور نقشہ سامنے آتا ہے۔

نعت گوئی کے عظیم سلسلۃ الذہب میں عالمی شہرت یافتہ شاعر، نقاد، ادیب اور افسانہ نگار پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا نعتیہ مجموعہ ''ہر سانس محمد پڑھتی ہے'' بھی شامل ہے جو اس وقت میرا خاص موضوع ہے اور جو اپنی منور سانسوں سے بالیقیں میری ذہنی فضا کو نورانگیز کر رہا ہے۔ بیشک مناظر عاشق ہرگانوی نے فنی نکات اور پابندی فکر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا یہ کامیاب شعری اثاثہ دنیائے ادب کو دیا ہے۔

مناظر کی نعتوں کے مطالعہ نے راقم کو اتنا احساس تو ضرور دلایا ہے کہ ان کے لاشعور میں نورانی نعتوں کا جذبہ برسوں سے پوشیدہ تھا، لیکن اسے شعور تک پہنچنے اور قرطاس کی زمین پر قدم رکھنے میں تقریباً ساٹھ سال کا وقفہ لگا۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جانہ ہوگا کہ مناظر کے اندر کا جذبہ نعت نویسی برسوں سے درود اسم محمد میں محور رہا ہے، جس کا اظہار موصوف نے یوں کیا ہے۔

بھیجوں درود اس پہ مناظر نہ کیوں بھلا
دافع مرے غموں کا محمد کا نام ہے

درود و سلام اپنے پیارے نبی پر
جو ہیں سب سے اعلیٰ و بالا و برتر

محمد شناسی سے خدا شناسی کی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ایک طویل عمر کے ساتھ ساتھ مقامات محمدی کو سمجھنے کا درک بھی لازمی ہے۔ اس سلسلے میں مناظر کیا کہتے ہیں دیکھئے۔

کوئی کم علم کیا سمجھے نبی کا مرتبہ کیا ہے
خدا ہی جانتا ہے کہ مقام مصطفیٰ کیا ہے

پھر مدحت رسول اکرم سے متعلق مناظر کا یہ شعر بھی پڑھئے۔

مدحت کا ان کی کیسے بشر سے ہو حق ادا
خود جب خدا ثنا خواں نبی کا دکھائی دے

ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق کی رائے ہے کہ معراج کے تعلق سے دور قدیم کے شعرا نے بہت سی خیالی باتیں مشہور کر دی تھیں۔ مولانا باقر آگاہ ویلوری نے ان کی تردید کی اور صحیح حالات نظم کر کے اصلاحی اور تبلیغی دونوں خدمات انجام دیں۔ مناظر نے بڑے اچھے انداز سے معراج کی تصویر کھینچی ہے۔

ہمارے لئے لائے معراج سے جو
نماز ایسا تحفہ ہے پیارے نبی کا

محبوب کبریا ہیں اسی کا ہے یہ ثبوت
معراج میں جو عرش پہ مہماں رسول ہیں

معراج مصطفیٰ سے صداقت ہے یہ عیاں
کی جس نے انبیا کی امامت حضور ہیں

مناظر کے بعض نعتیہ اشعار کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے روضہ اقدس کے ایک گوشے میں بیٹھ کر یہ اشعار تحریر کئے ہیں، جن میں رسول پاک سے بے پناہ محبت وعقیدت کی خوشبو ہر لفظ سے عکس ریز ہے۔

محمد سر لفظ کن ، محمد نور یزانی
بنائے بزم دو عالم ، بقائے نظم حقانی

تخلیق کائنات کی غایت حضور ہیں
سر پہ ہے جن کے تاجِ رسالت حضور ہیں

اہل جہاں کے واسطے ہیں رحمتیں تمام
بے شک ہمارے درد کا درماں رسول ہیں

مناظر نے نئی نئی زمینوں میں نئے نئے قوافی اور ردائف نعتیہ شعری ادب کو دی ہیں ان کی فکری تراش وخراش ان کی تمام تر نعتوں میں جلوہ افروز ہے۔

ہر دن ہے نگاہوں میں مدینہ کا تصور
ہر رات ہے خوابوں میں مدینہ کا تصور

سکون قلب ونظر ہے رسول پاک کا نام
دوائے درد جگر ہے رسول پاک کا نام

اب جائیں گے ہم بھی مدینہ انشا اللہ
روضۂ آقا ، بانم دیدہ ، انشا اللہ

اس زندگی کا مقصد اعلیٰ دکھائی دے
وقت اجل حضور کا جلوہ دکھائی دے

جب بھی کبھی پڑھا ہے صلی علیٰ محمد
ہر درد مٹ گیا ہے صلی علیٰ محمد

ایک جگہ مناظر کا پاکیزہ جذبہ وفکر روضۂ انور کو یوں چومنے لگتا ہے۔

افکار میرے چومے ہیں روضے کو نبی کے
تابندہ ہے لفظوں میں مدینے کا تصور

مناظر نے حضور اکرم کی نورانی عظمتوں کا احاطہ یوں کیا ہے۔

جہان فکر پر چھائی ہوئی ہیں ظلمتیں ہر سو
محمد عالم افکار میں قندیل نورانی

محمد شوکت صبر و شکیب و عزم و دانائی
محمد پیکر نوری ، شکوہ روح عرفانی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شافع محشر ہونا مسلمانوں کا جز وایمان ہے۔ مناظر کیا کہتے ہیں سنئے۔

محمد رحمت عالم ، شفیع عرصہ محشر
محمد ذوق فقرانہ ، محمد شوق سلطانی

کیا پوچھنا ساقی کوثر بھی ہیں وہی
بے شک شفیع روزِ قیامت حضور ہیں

فضل خدا ہو تجھ پہ مناظر بہ روز حشر
بگڑی تری بنادے شفاعت رسول کی

مناظر نے ایک بڑی اہم سچائی کی طرف اشارہ یوں کیا ہے۔

وہ جاتے ہیں مکے اور مدینے
محمد مصطفیٰ جن کو بلائیں

نعت گوئی میں الفاظ کا چناؤ، زور بیان، روانی، سلاست اور قوت پرواز سے ہٹ کر واقعات کی سچائی سے کام لینا ضروری ہے اور یہ کام مناظر نے بڑے سلیقہ سے، سنجیدگی کے پاکیزہ حدود میں رہ کر کیا ہے اور اپنی دلی تمناؤں کو یوں شاعری کی زبان دی ہے۔

روضے پہ حاضری ہو، کروں پیش میں سلام
دل میں یہی ہے آرزو، ارمان ہے مصطفیٰ

اللہ مناظر کو دکھا شہر نبی تو
ڈھلنے لگا اشکوں میں مدینہ کا تصور

اور جب مناظر مدینہ کا تصور اپنی آنکھوں میں سمائے مدینہ کے سفر پر نکلے تو ان کے دامن احساس کا منظر کچھ یوں تھا۔

چلا ہوں لے کے نذرانہ بس اتنا
آنکھیں نم ہیں کچھ دامن بھی تر ہے

نعت کہنا بہت آسان ہے، مگر اپنی قلبی واردات اور ذہنی کیفیات کو سہل جذبہ وفکر کے ساتھ ساتھ سادہ انداز بیان اور عام فہم الفاظ میں پیش کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ دیکھئے مناظر اس فن میں کہاں تک کامیاب ہیں۔

انسان کیا بیاں کرے عظمت رسول کی
قرآں سے آشکار ہے رفعت رسول کی

مقام ایسا ہے پیارے مصطفیٰ کا
کہ وہ محبوب ہے اپنے خدا کا

دین کامل رسول خدا ہو گئے
آپ عرفان حق کا پتہ ہو گئے

بحیثیت مجموعی مناظر عاشق کی تمام نعتیں ان کی اختراعی سربلندیوں کی طرف مائل بہ پرواز ہیں، گویا موصوف نے قدیم روایات کی مشعل سے ایک اور پرنور مشعل جلائی ہے، جس کی روشنی ہر عاشق رسول کے دل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب وکامراں ہے۔ ❀❀

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

ڈاکٹر پرویز شہریار
Editor, N.C.E.R.T. New Delhi - 110016

افسانہ ''گرہن'' کا تنقیدی جائزہ

اردو فکشن میں راجندر سنگھ بیدی اپنے منفرد و ممتاز اسلوب کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی کہانیوں کی بھی ایک الگ اور نمایاں پہچان ہے،جن میں اکثر و بیشتر ہندوستانی دیو مالائی اور اساطیری عناصر کسی نہ کسی رنگ اور روپ میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ان کا رشتہ بعض اوقات کروڑوں سال پرانے انسانوں، دیوی ، دیوتاؤں سے ہوتا ہوا دیولوک اور پرلوک سے بھی جاملتا ہے۔ان کے بظاہر معمولی نظر آنے والے کردار اپنے اندرون میں پھیلے ہوئے صدیوں کے تہذیبی اور مذہبی تصورات وعقائد پر محیط ہوتے ہیں۔

بیدی کو موضوعات کا بادشاہ بھی کہا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع اور تکثیریت بدرجہ اتم موجود ہے، تاہم ان کے موضوعات کبھی اجنبی یا انجانے نہیں ہوتے، بلکہ اسی سرزمین سے وابستہ اور عام زندگی سے مستعار ہوتے ہیں۔شہری ہوں یا دیہی ان کے کردار اپنی بنیادی تشکیلی خصلت کے اعتبار سے ہماری صدیوں پرانی ہند آریائی تہذیبی اور مذہبی عقاعد سے کہیں نہ کہیں جڑے ہوتے ہیں۔

افسانے کی کرافٹ مین شپ کی اگر بات کی جائے تو بیدی کے یہاں چیخوف، گوگول، شوپنہار وغیرہ کے اثرات تلاش کیے جاسکتے ہیں اور اس کی مثال کے طور پر ان کے شاہکار افسانے ''بھولا''، ''گرم کوٹ''، ''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ''دس منٹ بارش میں''، ''گرہن'' اور ''لاجونتی'' وغیرہ پیش کیے جاسکتے ہیں، جہاں ہندوستانی صنمیات کے ساتھ ساتھ ہیئت اور تکنیک کی سطح پر مغربی ماسٹر کرافٹس سے مماثلت رکھنے والے وہ عناصر بھی ہیں، جن میں بیدی کی فنکارانہ عظمت دیکھی جاسکتی ہے۔یوں دیکھئے تو ان کی تقریباً ہر کہانی میں فکر و فن کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور نظر آجاتی ہے۔

اس زاویۂ نظر سے اگر بیدی کے افسانہ ''گرہن'' کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسی دکھی اور مجبور عورت کی کہانی ہے جسے اس کی سسرال میں ہر وقت ستایا جاتا ہے۔اس عورت کا نام ہولی ہے،جس کے چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو گزشتہ چھ سال میں پیدا ہوئے ہیں اور پانچواں بچہ پیٹ میں ہے۔اس کا مائکہ سارنگ دیوگرام ہے،جو اس کی سسرال سے اتنی دور ہے کہ وہ وہاں چاہ کے بھی نہیں پہنچ سکتی ہے،لیکن وہ اپنی سسرال والوں سے اس قدر عاجز آچکی ہے کہ بھاگنے کے کئی ناکام ارادوں کے بعد چاند گرہن والی رات میں ایک بار پھر کوشش کرتی ہے، جب سمندر میں نہانے کے لیے عورتیں اور مرد الگ الگ مقامات پر چلے جاتے ہیں،لیکن اس رات اپنے ہی گاؤں کے ایک نوجوان کتھو رام جو کہ اس کے بچپن کا ساتھ کھیلا ہوا منھ بولا بھائی ہے اور ایک دوسرا شخص ،سرائے کا مالک ، جو نشے میں چور ہوتا ہے، دونوں ہی اس حاملہ عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔عین چاند گرہن کے لمحات میں'' پکڑو، پکڑو''،وہ دونوں چلاتے ہیں اور وہ بھاگ رہی ہوتی ہے،مگر دوسری طرف اس کی سسرال اساڑھی گاؤں سے آواز آتی ہے۔''چھوڑ دو، چھوڑ دو،دان کا وقت ہے'' اور وہ حاملہ اپنا پیٹ پکڑے گرتی پڑتی بے تحاشہ بھاگ رہی ہوتی ہے۔

اس افسانے میں ہولی اساڑھی گاؤں کے کائستھوں کی بہو ہے اور جیسا کہ اوپر ابھی ذکر کیا گیا، اس کے چار بچے ہیں اور پانچواں اس کے پیٹ میں ہے۔ہولی کا شوہر رسیلا ہے جو ہولی کی صحت اور سندرتا کا حاسد ہے۔ہولی کی سوچ میں وہ ایک راہو کی طرح کالا سا راکشس جیسی شکل والا شخص ہے جو بچے کی پیدائش کے سوا مہینے کے اندر ہی بیوی کی قربت کا جویا ہو کر اس کے پاس آدھمکا ہے۔تیسرا کردار ہولی کی ساس میا کا ہے جو اسے اٹھتے بیٹھتے گالی گلوج کے انداز میں لعن طعن کرتی رہتی ہے۔دونوں ماں بیٹوں نے اس کا جینا حرام کر رکھا ہے۔اس کا

دیور بھی اسے پیٹتا ہے۔ ہولی کے چار بچے روپو،شبو،کھتو اور منا ہیں جنہیں وہ اپنے سسر کے پاس جب کبھی ضرورت ہو، چھوڑ کر جاتی ہے۔ اس کا سسر بھی اسے ڈانٹتا ہے۔رسیلا جنس زدہ ہے اور وہ ہر صحیح غلط باتوں پر ہولی کو چپت لگا دیتا ہے اس پر میا جھوٹے ڈھونگ رچا کر بیٹے کو ڈانتی ڈپٹتی رہتی ہے،لیکن ہولی کو یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے۔اسے اپنے میکے سارنگ دیو گرام کی یاد بہت آتی ہے۔وہ اپنے کنوارے پن کے دنوں کو بڑے چاؤ سے یاد کرتی ہے۔عورت کی بپتا یہ ہے کہ جب میکہ میں ہو تو سسرال کو بڑے چاؤ سے یاد کرتی ہے اور جب سسرال آتی ہے تو میکے کی یاد اسے بے چین کر دیتی ہے۔

میکے کی یاد اسے اس لیے بھی زیادہ آتی ہے کہ وہ ایک متمول ساہوکار سیتل کی بیٹی تھی،لیکن سسرال میں کائستھوں کے ہاتھوں اسے ذلیل ہونا پڑتا تھا۔چار بچوں،تین مردوں،دو عورتوں اور چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور وہ اکیلی سب کے کھانے پینے کا انتظام کرتی اور روزانہ ان کے جھوٹے برتنوں کے انبار کو صاف کرتی رہتی تھی۔اس کے باوجود ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔کائستھوں کو تو بچے چاہئیں،ہولی جہنم میں جائے۔گویا سارے گجرات میں یہ کائستھ ہی،''کل ودھو'' کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

''ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں
رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور بچے کی وجہ سے کھایا
پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا،شاید اسے روٹی
بھی اسی لیے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے۔''

اس کی مصیبت اور پریشانی میں خود ہولی کے عقیدے کی کمزوری کا بھی ہاتھ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے سسرال والوں کو بھلا اس کی جان لینے کا کیا حق ہے۔البتہ رسیلا اس کا شوہر اس کی جان لے لے تو کوئی بات نہیں کیوں کہ''شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا!''اور یہی کمزوری اس کی گرہست زندگی کو تہس نہس کر کے جہنم کی آگ میں بدل دیتی ہے،جس سے وہ بالآخر اپنی عصمت وعفت کا دامن بھی بچا نہیں پاتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے''گرہن''میں اس صدیوں سے چلے آرہے میتھ پر چوٹ کی ہے،جس میں چاند گرہن کے وقت اس لیے دان پن کیا جاتا ہے کہ انسان کے سال بھر کے پاپ ڈھل جائیں۔ سمندر میں اسنان کرنے، پھول، بتاشے اور مشک کافور کے چراغ پانی میں بہانے سے گناہ نہیں دھلتے اور مرنے کے بعد کے سفر میں میا جیسی گناہگار اور ظالم ساس کے راستے روشن نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے تزکیہ نفس زیادہ ضروری ہے۔دوسرے یہ کہ عورت کو مرد اپنی ہوس کا شکار بناتا آیا ہے۔اس کی اس بہیمیت پر رسم ورواج،مذہب اور عقائد سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔چاند گرہن کے وقت ہندو عقائد کے مطابق نیک کام کرنے چاہئیں تاکہ راہو اور کیتو نام کے راکشس اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور وہ اندو(چاند)کو چھوڑ دیں،لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان سے بڑا راکشس شاید صفحۂ ہستی پر کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہے۔جنس زدہ انسان خواہ رسیلا ہو یا کہ کتھورام،کسی موسم،کسی رشتے کی پرواہ نہیں کرتے حتیٰ کہ عورت کی جسمانی کیفیت کس بات کی متقاضی ہے اس کی بھی انہیں چنداں پرواہ نہیں ہوتی۔وہ کتھورام گاؤں کا منھ بولا بھائی بچپن کا ساتھی،ایک بے سہارا،تنہا اور یہاں تک کہ اپنے ہی گاؤں کی ایک حاملہ عورت سے بھی اپنی جنسی ہوس پوری کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتا اور کوئی عار محسوس نہیں کرتا بلکہ اپنی اس شرم کو دور کرنے کے لیے وہ شراب پیتا ہے اور سرائے کے مالک کو بھی اس بدکاری میں مدعو کر لیتا ہے،جو وہ شاید نشے کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔دوسرے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نشہ بھوگ ولاس کے جوش کو دوبالا کر دیتا ہے۔

بیدی نے صدیوں سے چلے آرہے اس رواج کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔بیدی کو عورت کی مظلوم ذات سے ازلی ہمدردی رہی ہے۔انہوں نے''ایک چادر میلی سی''میں بھی اس مقدس جگہ کوٹلہ میں ڈھونگی دھرماتماؤں کے ذریعے ہونے والی بدکاری کا پردہ فاش کیا تھا جہاں ویشنو دیوی نے بھیروں کے چنگل سے خود کو بچا کر گھڑی دو گھڑی کے لئے بسرام کیا تھا اور وہیں تلوکا کی مدد سے دھرم شالہ کے مالک چودھری مہربان داس اور اس کے بھائی گھنیشام اور لوہے کی لنگوٹ والا باوا ہری داس ایک بارہ تیرہ سال کی جاترن لڑکی کے ساتھ اپنی جنسی ہوس کی آگ ٹھنڈی کرنے کے چکر میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

بیدی کو دیوی کا جلالی روپ پسند ہے جب وہ چنڈی ، بھیروی اور کالی کا روپ اختیار کر لیتی ہے، لیکن انہیں مظلوم عورتوں سے ہمدردی ہے۔ مرد اس سماج کا وہ ظالم جانور ہے جو عورت کو راہو کیتو بن کر اسے گہنانے کی تاک میں ہر دم لگا رہتا ہے۔ سادھو مہا تماؤں کے دور پاس کے رشتے دار حتیٰ کہ خود شوہر بھی اس کے ساتھ بہیمانہ سلوک کے ساتھ پیش آتا ہے۔ پسماندہ سماج کے اس طبقے میں سسر اور دیور بھی اس پر مظالم ڈھاتے ہیں۔ ہولی اس کی بہترین مثال ہے۔ یہاں گرہن ایک ایسے سماج کا استعارہ بن جاتا ہے جس میں بقول وارث علوی:

''ازدواج مسلسل جنسی سرگرمی کا وہ پروانہ ہے جو خود سماج افراد معاشرہ کو بہ رضا و رغبت عطا کرتا ہے۔'' (راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۵۲)

رسیلا ہولی کو جو خود اس کی بیوی ہے، ہوس کی نظر سے دیکھتا ہے، اس وقت بھی جب کہ وہ حاملہ ہے اور اس کے پانچویں بچے کی ماں بننے والی ہے:

''رسیلے نے ایک پر ہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھوا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا: 'میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کاہے کی تھی؟' ......'جلدی کیسی؟' رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: 'یہی، تم بھی تو کتیا ہو، کتیا؟' ......ہولی سہم کر بولی: 'تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟' ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن، ہوس راں سبھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی۔ رسیلا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔''

ہولی کو اس کی سسرال میں ہر بات پر ٹوکا جاتا ہے۔ اس کی تعلیمی لیاقت کا افسانے میں ذکر نہیں ہے تاہم اس کے حرکات و سکنات سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی اندو بھی نہیں تھی، لیکن وہ فطری طور پر سمجھدار بہت تھی۔ جب کہ ہولی زیادہ سمجھدار بھی نہیں ہے، کیوں کہ افسانے کے اختتام میں رونما ہونے والے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ابلہ ناری ہے اور اپنے لیے مصیبت خود بھی کھڑی کر لیتی ہے۔ جب وہ بھاگنے کا ارادہ کرتی ہے اور اس خیال سے گرہن والی رات کا انتخاب کرتی ہے تو اسے معلوم ہے کہ آٹھ بجے اسٹیمر لانچ کی آخری سیٹی تھی، پھر وہ سارنگ دیوگرام کی طرف روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں اور پھر وہی اماں، کنوارپن اور گربا ناچ، لیکن ان سب معلومات کے باوجود وہ ٹکٹ خریدنے کے لیے اپنے پاس پیسے نہیں رکھتی ہے۔ اپنے شوہر اور ساس سے جدا ہوتے وقت وہ اپنی دھوتی میں چند روپے اُڑس سکتی تھی، اپنی اس ایک بے وقوفی سے وہ ہوس راں ٹینڈل اور دیگر تین چار آدمیوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ تو جاتی ہے، مگر کتھورام اور سرائے کے مالک اسے اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔ ہولی کے سسرال سے بھاگنے کے ارادے میں کوئی کمی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ اپنے بیٹے شبو سے جدا ہوتے وقت وہ جذباتی ہو کر اس کا منھ چوم لیتی ہے اور اس کے آنسوؤں کا گرم گرم قطرہ جب شبو کے گالوں پر پڑتا ہے تو وہ بھیٹر میں کچھ نہ سمجھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

سسرال کی مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسی ہوئی تنہا عورت پلٹ کر جب اپنے میکے کو دیکھتی ہے تو تصور میں اسے اپنے گاؤں سارنگ دیوگرام کی خوبیاں، اپنی سکھی سہیلیاں اور کنوارے پن کی آزادیاں بے طرح سے یاد آنے لگتی ہیں:

''کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گربا ناچا کرتی تھی اور بھابھی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کی سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت عورتیں اپنے حنا بالیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں۔

ماہندی   توادی   مالوے

اینو رنگ گجرات رے
ماہندی رنگ لاگیورے
(حنا تو مالوہ......وسط ہند میں پیدا ہوئی۔اس میں گجرات
رنگا ہوا ہے۔گویا اسے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔)
اس وقت وہ ایک اچھلنے کودنے والی الھڑ چھوکری تھی۔
ایک بحروقافیہ سے آزاد نظم، جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔
گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔نباب جادی تو نہ تھی اور
اس کی سہیلیاں......وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں
کے پاس جا چکی ہوں گی۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہولی، اندو کی طرح سمجھدار اور سگھڑ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ رسیلا نے جو برتاؤ رکھا ہے اس سے اس کے جسم اور دماغ بری طرح ضعف کا شکار ہو چکے ہیں۔اس سب کے باوجود وہ اچھے اور برے میں تمیز ضرور کر سکتی ہے:

''اس کی آنکھوں کے گرد گہرے، سیاہ حلقے پڑنے لگے،
گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔
وہ ہولی جسے پہلے پہل میا پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا
کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا رسیلا حاسد تھا،
گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔''

اپنی اس ناگفتہ بہ حالات کے باوجود وہ جانتی ہے کہ میا نے اس پر جو مظالم ڈھائے ہیں، اسے ستانے کے گناہ کا جو ارتکاب کیا ہے، وہ قابل معافی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ چاند گرہن کے وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گزشتہ سال کرتے رہے ہیں۔اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتے ہیں۔سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے۔ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں، پھر گہنا جاتے ہیں، پھر دریا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر سب کچھ پاک صاف ہو جاتا ہے۔اس کے باوجود اسے ڈر ہے کہ میا نے جو گناہ کئے ہیں، وہ اس سمندر کے پانی سے دھلنے والا نہیں ہے:

''بڑی اماں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ مشک
کافور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں میں بہا دینا چاہتی
تھی تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن
ہو جائے اور ہولی ڈرتی تھی۔کیا اس کے گناہ سمندر کے
پانی سے دھل جائیں گے۔''

غروب آفتاب کے بعد ہر پھول بندرگاہ پر سمندر کے کنارے، گھاٹ سے پون میل کے قریب اسٹیمر لانچ میں ہولی ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہتی ہے۔اس کی بدحواسی کے دیگر کئی وجوہات میں ایک سب سے اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے پاس ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ جب یہ بات لانچ کے ٹینڈل کو معلوم ہوتی ہے تو وہ دیگر ملازموں سے سرگوشیوں میں ہولی کی بے چارگی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی بات کرنے لگتے ہیں، لیکن سوئے اتفاق وہاں اس کے گاؤں کا بچپن کا ساتھ کھیلا ہوا کتھورام چلا آتا ہے، جو آبکاری کا سپاہی ہے۔اسے دیکھ کر وحشیوں کے ناپاک ارادوں اور ان کے قہقہوں کی بلند آوازوں سے سہمی ہوئی ہولی کے حواس بجا ہو جاتے ہیں اور وہ سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیتی ہے اور کچھ دلیری سے بلاتی ہے اور اپنی یقین سے معمور، لیکن بھرائی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔

''کتھو بھیا! مجھے سارنگ دیوگرام پہنچا دو۔تبھی کتھورام کو
ہولی کی مجبوری کا پتہ چلتا ہے جب ان میں سے پاس
کھڑا ایک ٹینڈل کہتا ہے:'بیچاری کوئی دکھیا ہے۔اس
کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ہم سوچ رہے
تھے، ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

کتھورام بھی اسی سماج کا ازلی مرد ہے، جس کے اندر کا سگ اس بات سے ہوشیار ہو جاتا ہے کہ وہ اساڑھی سے بھاگ کر آئی ہے۔اس کے اندر کی کلبیت ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے وہ اسے مزید دھمکانے لگتا ہے:

یہ سرپیھ جادیوں کا کام نہیں ہے اور وہ اگر کائستھوں
کو خبر کر دے تو پھر کیا ہوگا۔ہولی ڈر سے کانپنے لگتی ہے،
کیوں کہ نہ تو وہ نباب جادی تھی اور نہ سرپیھ جادی۔''

کتھورام اسے یقین دلاتا ہے کہ:

''ڈرونہیں ہولی۔ میں تمہاری ہرممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پو پھٹے لے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں۔آج کی رات سرائے میں آرام کرلو۔''

لیکن کتھو رام جب سرائے کے مالک کے دریافت پر ہولی سے متعلق جواب دیتا ہے کہ یہ''یہ میری پتنی ہے۔''تو ہولی گھبرا کر بدحواسی میں اپنا پیٹ پکڑ کر دیوار کے سہارے سرکتی ہوئی وہیں ڈھیر ہو جاتی ہے۔

کتھو رام سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیتا ہے۔ اسے کمرے میں چھوڑ کر خود شراب پی کر اندر آتا ہے۔اس کے بعد آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔ دودھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لیے سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے، جو ابھی ابھی سرائے سے نکل کر بھاگی تھی۔سرپٹ، بگٹٹ۔ وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی۔

''دور،اساڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں
دان کا وقت ہے۔
چھوڑ دو، چھوڑ دو، چھوڑ دو۔
ہر پھول بندر سے آواز آئی......
پکڑ لو، پکڑ لو، پکڑ لو۔
چھوڑ دو، دان کا وقت ہے، پکڑ لو، چھوڑ دو۔''

وارث علوی نے گرہن کا آرکی ٹائپ ایک بلبل گرفتار کو بتایا ہے جو قفس سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ وہ ہولی کی ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس کی صرف ایک ہی خواہش ہے کہ سفینۂ غم کو کہیں ساحل مل جائے۔ ہولی کا پورا وجود دکھ کا تاریک زنداں ہے اور اس میں صرف ایک خواہش رہ گئی ہے، خواہش نجات، قید سے رہائی، مکتی......مکتی......مکتی۔''

(راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ، ص ۳۰۸)

انہوں نے مزید لکھا ہے کہ یہاں بیدی کا حملہ پورے ہندوستانی معاشرے پر ہے جہاں زندگی کا دوہرا معیار اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک انسان سے جانوروں سے بدتر سلوک کرنے کے باوجود چاند گرہن کے وقت پوجا پاٹ اور اشنان کرنے سے وہ سمجھتے ہیں کہ سارا پاپ دھل جاتا ہے، بقول وارث علوی:

''بیدی نے افسانہ کا تارو پود اس طرح بنا ہے کہ عورت سماج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ایک وجودی فینو مینا بن گئی ہے۔ چاند گرہن کا پس منظر اسے سماجی فینو مینا سے اٹھا کر کائناتی تناظر عطا کرتا ہے۔ سماج کی مخالف قوتوں کی شکار عورت اب بے رحم فطرت اور لب بند کائنات کا فینو مینا بن جاتی ہے۔ بیدی کا کمال یہ ہے کہ زندگی کی مانوس حقیقتوں اور عام واقعات سے بنی ہوئی ایک گھریلو کہانی سناتے سناتے اسے ایک ایسے عروجی نکتہ پر پہنچاتے ہیں جہاں عورت کی بے بسی ایک نامہربان کائنات میں وجود کا ہولناک المیہ بن جاتی ہے۔''

ہولی شوہر، ساس اور سپاہی کے شیطانی جال میں پھنس کر خود کو تباہ ہونے سے بچا نہیں پاتی ہے۔ قارئین کو تعجب ہوتا ہے کہ ہولی اپنے میکے میں اپنے باپ سیتل ساہوکار کو سندیسہ کیوں نہیں بھیجتی ہے۔ حیات اللہ انصاری نے رسیلے کے غصے کو شہوت میں ٹھکرائے ہوئے مرد کے غصے سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے اور جہاں تک آبکاری کے سپاہی کا تعلق ہے، شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے ایک اچھے انسان کا فرض یاد دلایا ہے یہ کہہ کر کہ اسے چاہیے تھا کہ وہ ٹکٹ خرید کر ہولی کو سیوا گرام کی طرف روانہ کر دیتا۔

بہر حال، وارث علوی نے اس افسانے کے تجزیے کے دوران چند بہت اہم سوال اٹھائے ہیں، جن کا تعلق آرٹ کے تفاعل سے ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''مثلاً ہولی کا کیا ہوا؟ وہ مرگئی، خودکشی کی، اس کا اسقاط ہو گیا، آرٹ کے جادو نے گہنائے ہوئے چاند کی مانند بھاگتی ہوئی ہولی کو بھی ایک ایسا فینو مینا بنا دیا کہ ہم اسے خوف اور حیرت سے اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے ایک ٹوٹتے ہوئے تارے کو اور یہ سوال نہیں پوچھتے کہ تارا کہاں پر جا کر گرا۔ یہ افسانہ ہی ایسا ہے، جس کا انجام واضح، قطعی اور دوٹوک نہیں ہوسکتا۔ افسانہ کا انجام ہولی کا

انجام ہےاور ہولی کی جو کہانی بیان کی گئی ہےاس کا انجام
کیا ہو،ہم نہیں جانتے۔''

(راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ،ص ۳۱۸ وص ۳۱۹)

راجندر سنگھ بیدی کے تخلیقی سفر میں ''گرہن'' کوفنی اعتبار سے ایک Break Through کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''دانہ ودام'' کی مطلق حقیقت نگاری جس پر چیخوف اور گوگول کے اثرات بتائے جاتے تھے، یہ افسانہ ان سے یکسر مختلف فنی تکنیک اختیار کر لیتا ہے۔ موضوع وہی معمولی گھر گرہستی کی روزمرہ کی زندگی ہے، لیکن پیش کش غیر معمولی ہے۔ اس میں سطحی بیانیہ انداز اختیار کرنے کے بجائے معنوی تہہ داری اور دیو مالائی اسطورہ نے جادوئی اثرات پیدا کر دیے ہیں۔ اساطیر کی روشنی میں کردار کے سائے طویل القامت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مظفر علی سید نے گرہن کے تجزیاتی مطالعہ میں لکھا ہے کہ:

''ذرا ایک نظر 'گرہن' پر ڈال کر دیکھئے اور سوچئے کہ کیا اب بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ 'بیدی کے یہاں تیز جذباتیت، غیر معمولی واقعات اور طوفانی حادثات شاذ ہی ملتے ہیں۔' کیا اب بھی یہ قول درست ہے کہ 'روزمرہ کے معمولی سے معمولی واقعات، عام جذبات واحساسات اور سیدھی سادی حقیقت کو نرمی، لطافت اور پاکیزگی سے پیش کرنے کا ان میں چیخوف کا سا سلیقہ ہے اور ان کے افسانوں کو یہ سیدھی سادی حقیقت ہی لطیف اور دلکش بنا دیتی ہے۔'' (عصری آگہی، دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۵)

بیدی کو اس بات کا اعتراف ہے کہ:

''لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں نفس مضمون کا محض ظاہری (یا جسمانی) پہلو پیدا ہوا، یہاں تک تو مشاہدے کا تعلق تھا۔ اس کے بعد میرے تخیل نے طنز کی صورت میں ایک باطنی پہلو تلاش کر لیا...... ذہن وتحریر میں دونوں آپس میں یوں گھل مل گئے کہ مجموعی طور پر ایک تاثر کی صورت اختیار کر لی۔''

آل احمد سرور نے بیدی کے قدرے بعد کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

''پریم چند کی آدرشی حقیقت نگاری جو کرشن کے یہاں رومانی حقیقت نگاری نظر آتی ہے، بیدی کے یہاں ایک ایسی حقیقت نگاری بن جاتی ہے جو اسطور اور دیو مالا کے سایوں کی وجہ سے حقیقت سے کچھ بڑی اور کچھ پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔''

اس تناظر میں ''گرہن'' کی اہمیت اس لحاظ سے بڑھ جاتی ہے کہ بیدی نے پہلی بار اس افسانے میں دیو مالا کا براہ راست استعمال کیا تھا، جس طرح دیولوک میں چاند اور سورج کی شکایت پر امرت پینے والے راہو کا ویشنو بھگوان نے اپنے سدرشن چکر سے سر قلم کر دیا تھا اور اس کے سر اور دھڑ آسمان پر راہو اور کیتو بن کر معلق ہو گئے تھے اور ہر سال میں دو بار چاند سورج سے بدلہ لینے کے لیے چاند اور سورج کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں تو ان میں گرہن لگ جاتا ہے اور دان پن کے ذریعے اسے قرض سے نجات دلائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس افسانے میں ہولی (چاندرانی) کو رسیلا اور کتھورام اپنے شکنجے میں جکڑتے چلے جاتے ہیں اور ہولی کو آخر کار، اپنے نام وناموس اور جسم وجان کی بلی دے کر یہ قرض چکانا پڑتا ہے، جسے افسانے میں دوٹوک بیان کرنے کے بجائے اسے قارئین کے تخیل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ''گرہن'' کے اساطیری پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ کہانی جس میں بیدی نے استعاراتی انداز کو پہلی بار پوری طرح استعمال کیا اور اساطیری فضا ابھار کر پلاٹ کو اس کے ساتھ تعمیر کیا ہے، 'گرہن' ہے۔ اس میں ایک گرہن تو چاند کا ہے اور دوسرا گرہن اس زمینی چاند کا ہے، جسے عرف عام میں عورت کہتے ہیں اور جسے مرد اپنی خودغرضی اور ہوسناکی کی وجہ سے ہمیشہ گہنانے کے درپے رہتا ہے۔ ہولی ایک نادار، بے بس اور مجبور عورت ہے۔ اس کی ساس راہو ہے اور اس کا شوہر کیتو جو ہر وقت اس کا خون چوسنے اور اپنا قرض وصول کرنے میں لگے

رہتے ہیں۔ ہولی کی سسرال سے مائکے بھاگ نکلنے کی کوشش بھی گرہن سے چھوٹنے کی مثال ہے، لیکن چاند گرہن سے سماجی جبر کا گرہن زیادہ اٹل ہے۔ ہولی گھر کے کیتو سے بچ نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو اسٹیمر لانچ کے کیتو کتھورام کی گرفت میں آجاتی ہے، جو اسے رات بھر کے لئے سرائے میں لے جاتا ہے اور اس طرح یہ خوبصورت چاند ایک گرہن سے دوسرے گرہن تک مسلسل عذاب کا شکار ہوتا ہے۔ اس کہانی کی معنویت کا راز یہی ہے کہ اس میں چاند چاند گرہن اور اس سے متعلق اساطیری روایات کا استعمال اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ کہانی کی واقعیت میں ایک طرح کی مابعد الطبیعیاتی فضا پیدا ہوگئی ہے۔'' (فکشن شعریات: تشکیل وتنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۱ء، ص ۹۳ وص ۹۴)

مظفر علی سید نے ''گرہن کے تجزیاتی مطالعے'' میں کئی بنیادی سوالات اٹھائے ہیں اور اس وقت تک کی کئی مسلمہ رائیوں سے انحراف اور اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افسانے میں چھپی ہوئی معنویت کو نمایاں کرنے کا یہ مفہوم تو نہیں ہونا چاہیے کہ خود افسانہ ہی اس کے بوجھ تلے پس کر رہ جائے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''گرہن'' اردو کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہونے کے بجائے محض ایک بیج سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور یہ وہ بات ہے جسے بیدی کا ہمدرد ناقد بھی کہے تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا...... ہاں اگر بعد میں بیدی نے کسی جگہ کوئی ایسا مقام حاصل کر لیا ہے، جو اس تعریف کا مستحق ہو کہ 'خارجی حقیقت میں آفاقی حقیقت یا محدود دمیں لامحدود دیکھنے کی یہی خصوصیت جو گرہن میں ایک بیج کی حیثیت رکھتی ہے، آزادی کے بعد بیدی کی کہانیوں میں ایک مضبوط اور تناور درخت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ تو پھر یہ ماننا پڑے گا۔'' (گرہن کے تجزیاتی مطالعے، عصری آگہی، دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۶)

دیومالائی اساطیر اور مابعد الطبیعیاتی عناصر کے استعمال سے اپنی کہانیوں کو پر اسرار اور ادھیا تمک فضا میں تبدیل کرنے کا عمل اسی ''گرہن'' سے شروع ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نقش اول کی کچھ خامیاں بھی موجود ہیں۔ ہولی ساہوکار کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ وہ کوئی نادار نہیں ہے۔ اس کے میکے والے ہیں۔ ''ایک چادر میلی سی'' کی رانی والی صورت حال بھی یہاں نہیں ہے۔ وہ جننی ہے، وہ دیوی کا جلالی روپ بھی دھارن کر سکتی ہے، لیکن یہ سب کچھ یہاں نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے عقل و شعور سے کام لیتی ہے، جب کہ بیدی کے' آزادیٔ وطن' کے بعد کے افسانوں میں مذکورہ عناصر کا استعمال اپنے فنی کمال اور تخلیقی عروج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ بیدی کا یہی امتیازی وصف انہیں اپنے معاصرین سے ممیّز وممتاز کرتا ہے اور انہیں انفرادی پہچان عطا کرتا ہے، جس پر نہ پریم چند کی چھاپ ہے نہ چیخوف کی، نہ گوگول کی۔ اگر ان پر کسی افسانہ نگار کی مہر ثبت ہے تو وہ صرف راجندر سنگھ بیدی کی ہے، جو افسانے کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔

❀❀❀

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code، مکمل پتہ اور موبائیل نمبر بھی تحریر کریں۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں اور تمام مطلوبہ تفصیلات لکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔ شکریہ!

ڈاکٹر عطا عابدی

C/o Book Emporium, Sabzibagh, Patna - 800004 (Mob. 7903021559)

بصیرت وعبرت کا شعری پیکر: سرائے فانی

تعزیتی تقریروں میں عام طور پر جس شعر کو زندگی کی بے ثباتی کے ترجمان کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

یہ بات غالباً کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ یہ شعر کس کا ہے۔ یہ شعر نواب مرزا شوق لکھنوی کا ہے، جو ان کی مثنوی ''زہر عشق'' سے ماخوذ ہے۔ مذکورہ شعر اور اس کیفیت کے مزید کئی اشعار کو ''سرائے فانی'' کے عنوان سے نظم کے طور پر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ شوق لکھنوی نے اپنی اس نظم ''سرائے فانی'' میں حیات فانی کی کئی عبرت انگیز اور بصیرت افروز شعری تصویریں پیش کی ہیں۔ اس نظم کے آخری شعر کے ذریعہ شاعر نے اپنی باتوں کا حاصل اتنے فطری اور راست انداز میں پیش کیا ہے کہ مذکورہ شعر تب سے آج تک تعزیت یا نصیحت کے مقام پر استعمال ہوتا آرہا ہے۔

موت ایک ایسی سچائی ہے، جس کا اقرار واعتراف ہر شخص کو ہے۔ موت کی سچائی کا کوئی منکر نہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے لئے یہ دنیا محض ایک سرائے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سرائے یعنی دنیا کو بھی ثبات حاصل نہیں ہے۔ موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں، اپنی اپنی باری پر، اپنی اپنی مدت گزار کر، سب کو اس دنیا سے چلے جانا ہے۔ اس حقیقت پر یوں بھی یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہم آئے دن لوگوں کو دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، جن میں غریب و مالدار کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ بڑے بڑے نامور سلاطین بھی گزر گئے، جن کے نام وکام سے دنیا مرعوب ومسحور رہتی تھی اور وہ مفلس ومجبور افراد بھی چلے گئے جو اپنے دور میں تو گمنام تھے ہی، آج بھی جنہیں کوئی نہیں جانتا۔ چونکہ ہم سب اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، لہٰذا موت سے انکار کے تصور کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔

نواب مرزا شوق لکھنوی نے ''سرائے فانی'' کے ذریعہ زندگی اور موت کی اسی صورت حال کو واضح اور فطری انداز میں پیش کرنے کی موثر فنکاری دکھائی ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ موت کی سچائی اور زندگی کی ناپائیداری کے حوالے سے کیفیت وتاثر کی دنیا لئے ہوئے ہے۔ نظم ''سرائے فانی'' کا ایک ایک شعر ہمیں سوچنے اور عمل صالح کی تاکید کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان اشعار کے ذریعہ مختلف مثالوں اور حوالوں کو سامنے لاکر شاعر ہمارے ذہن و دل میں اس ناقابل تسخیر حقیقت کو اُتارنے کی مخلصانہ کوشش کررہا ہے کہ کل جو کچھ تھا وہ آج نہیں ہے اور آج جو کچھ ہے وہ کل نہیں رہے گا۔ یعنی یہ زندگی چند روزہ ہے، اسے غنیمت جاننا چاہئے، اس کی قدروقیمت سمجھنی چاہئے۔ کرونا کے وبائی دور میں، ہر لمحہ زندگی کو غیر معمولی آزمائش سے دوچار ہوتے ہم سب دیکھ چکے ہیں، وقت کی قوت کا احساس واعتراف وقت کا تقاضا ہے۔

شاعر کا واضح لفظوں میں کہنا ہے کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے جو دراصل جائے عبرت ہے، جو لوگ کل اونچے اونچے مکانوں کے مالک تھے، وہ آج تنگ قبروں میں پڑے ہیں۔ کل جس چمن میں پھول مسکراتے تھے اور بلبلوں کا ہجوم رہتا تھا، آج وہ جگہ ویران و بیابان ہے۔ کل جو بادشاہِ ہفت اقلیم تھے، آج وہ زیر خاک ہیں۔ اب ان کا کوئی نام لیوا نہیں ہے، اس سے بڑھ کر عبرت کی بات اور کیا ہوگی۔ بہت سارے امرا جو تاجدار کہے جاتے تھے آج فاتحہ کے بھی محتاج ہیں، جو لوگ خودسری اور رعونت کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے، وہ بھی مٹی کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ شاعر اس کے آگے مزید کئی عبرت آموز پہلو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو لوگ دھوپ میں نکلنے سے گریز کرتے تھے کہ ان کا نازک جسم کمھلا نہ جائے، گردشِ چرخ نے ان کو بھی یوں ہلاک کر دیا کہ جلد کا ذکر ہی کیا کہ ان کی ہڈیاں تک خاک ہوگئیں۔ موت کی حقیقت نے بڑے بڑے نامیوں کا

نشان تک سلامت نہیں رہنے دیا، جن کے تاج میں گوہر ٹانکے جاتے تھے، آج ان کا کاسۂ سر ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ یہ اور اس طرح کی مزید باتیں کہتے ہوئے شاعر آخر میں اپنی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے ۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

فکری وموضوعی حوالے کے علاوہ یہ نظم فنی طور پر بھی عمدہ پہلو رکھتی ہے۔ فطری اور بے تکلف انداز کے سبب بھی ''مثنوی زہر عشق'' کا یہ حصہ زندگی کی ناپائیداری کی سچی تصویر بنانے میں کامیاب ہے۔ سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی و روانی ہے۔ اس کی ترکیب وترتیب میں ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جڑا ہے۔ ہر شعر سہل ممتنع کی خوبی لئے ہوئے ہے۔ بیشتر اشعار میں منظری تمثیل عمدہ فنکارانہ اطوار کے تحت ہے۔ متذکرہ شعر کے علاوہ بھی اس نظم کے دیگر کئی اشعار عبرت وموعظت کے صدہا موثر پہلو رکھتے ہیں ۔

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
تھے جو مشہور قیصر و فغفور
باقی ان کا نہیں نشانِ قبور

مذکورہ اشعار سرائے فانی کی وہ تصویریں ہیں جو وقت کی دیواروں پر آویزاں ہیں۔ ہم سبھی اپنی اپنی آنکھوں سے ان تصویروں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ عبرت ونصیحت کے حوالے سے ان اشعار میں تاثیر اور موعظت کی بے پناہ قوت موجود ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ''سرائے فانی'' اور ان جیسی دیگر نظموں کو، جن کا تعلق اخلاق واقدار کی تعمیر اور عبرت ونصیحت سے ہے، ہم اپنا موضوع گفتگو بنائیں۔ اخلاقی انحطاط اور قدروں کے زوال آمادہ دور میں ایسی تمام نظموں (یا دیگر تحریروں) کے بار بار مطالعے و جائزے کی طرف توجہ دیتے رہیں۔ ❁❁

کچھ غزل کے باب میں

تمام دنیا کی شاعری میں مضمون پہلے مقرر ہو جاتا ہے، پھر اس مضمون کے مناسب قافیے اختیار کئے جاتے ہیں (البتہ) غزل ایک ایسی صنف (ہے) جس میں مضمون سے پہلے قافیہ وردیف مقرر کر لیتے ہیں پھر اسی قافیہ وردیف کے مناسب مضامین اختیار کرتے ہیں۔ قافیہ وردیف کعبتین یا چوسر کے پانسے ہیں، چھکا بھی نکل آتا ہے، پو بھی نکل آتی ہے۔ یہ دو لوحیں ہیں جن سے مضمون کا طلسم کھل جاتا ہے۔ دو میل راہ ہیں جو مضمون کا پتہ دیتے ہیں، جو شخص پتہ کو سمجھ جاتا ہے، منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے، نہیں تو بہک کر گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔ قافیہ وردیف دو پر پرواز ہیں جس سے کبھی غزل گو عرش تک پہنچ جاتا ہے اور خزانہ عرش سے مضمون اُڑا لاتا ہے۔ اس کے علاوہ ردیف میں محاورے کی شوخی پیدا کرنا سننے والوں کے دل کو بے چین کر دیتا ہے۔ مرزا داغؔ کو اس باب میں یدطولیٰ حاصل تھا...... شعر کی ان دونوں صنفوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صنف میں عروض کا ایک وزن ہونا کافی ہے جو قریب قریب موسیقی کا ایک وزن ہوتا ہے۔ قافیہ کا ہونا نہ ہونا زبان کی ساخت پر منحصر ہے اور اس جدید صنف میں وزن بھی، قافیہ بھی بلکہ ردیف کا بھی ہونا ضروری ہے۔ معنوی اعتبار سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ اُس میں تسلسل ضروری ہے اور اِس میں قافیہ وردیف جو رستہ بتائے، غزل گو کو اسی طرف جانا چاہئے، مثلاً ''محمل'' کا قافیہ شاعر کو نجد کی طرف لے گیا اور ''بسمل'' نے اسے مقتل کی طرف کھینچا، اس وجہ سے غزل میں تسلسل باقی نہ رہا اور تسلسل نہ ہونے سے شعر کی وہ خوبیاں جو مسلسل بیان کے ساتھ مخصوص ہیں، غزل سے فوت ہو گئیں...... مسلسل مضمون میں تو ایسا سماں بندھ جاتا ہے اور شاعر کو ایسے مواقع بھی مل جاتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں بہت سے معنی اور بہت سی باتوں کو ادا کر دے (مگر) غزل گو کو دو مصرعوں میں ایسا میدان کہاں مل سکتا ہے؟ اب ثابت ہو گیا کہ غزل گو شعر کی اس خوبی سے محروم رہتا ہے جسے طلسم یا سحر یا اعجاز کہنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا سماں باندھ دینا جس میں شاعر یہ جادو جگا سکے، بڑے بڑے سخن سنجوں کو بھی شاذ و نادر ہی نصیب ہوتا ہے، لیکن غزل گو کے لئے تو ممکن ہی نہیں۔ (صوت تغزل، نظم طباطبائی، ص ا تا ص ۳ سے اخذ وتلخیص)

ابوالبرکات شاذ قاسمی
Taleemi wa Milli Foundation, Jagiraha, Bettiah (Mob. 8651781747)

غزلیات اقبالؔ: ارتقائی مراحل وخصوصیات

اردو شاعری میں غزل کی روایت کافی قدیم ہے اور تمام اصناف شاعری میں بے حد مقبول۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم وجدید دور کے تمام شعرا اس میں طبع آزمائی کی کوشش کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے بھی جب شاعری کی طرف رخ کیا تو غزل گوئی سے شروعات کی اور اپنے مزاج کے موافق اس فن میں انفرادیت کو قائم کیا۔ اقبالؔ کے دور میں غزل کے مختلف انداز موجود تھے، رنگین غزل، غزل مسلسل، روایتی غزل، رومانوی غزل، متصوفانہ غزل اور مسائلی غزل وغیرہ اور یہ کہنے میں کسی قباحت کا احساس نہیں ہوتا کہ اقبالؔ کی غزل گوئی میں ان تمام روایتوں کی جھلک اور بہترین آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے علامہ اقبالؔ نے داخلی جذبات کی نمائندگی کی اور خارجی جذبات کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا۔

اقبالؔ کی شاعری کا ابتدائی دور قدیم رنگ کا پاسدار رہا ہے۔ مرزا داغؔ دہلوی سے استفادہ کی وجہ سے ان کی غزل گوئی پر قدیم رنگ تغزل بہرحال چھایا رہا۔

یہ بات اہم ہے کہ اقبالؔ کی غزل گوئی کے پہلے دور میں لاہور کے اساتذۂ سخن جیسے مرزا ارشدؔ گورگانی اور نیر ناظم حسین ناظمؔ کا اثر غالب رہا۔ علامہ اقبالؔ نے ان شعرا سے بھی استفادہ اور مشورۂ سخن کیا تھا، اسی لئے اقبالؔ کی غزل گوئی کا پہلا دور روایتی انداز سے اپنی وابستگی رکھتا ہے۔ ''بانگ درا'' کے پہلے حصہ کی غزلیں اس روش کی واضح نمائندگی کرتی ہیں ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

غزل گوئی کے دوسرے دور میں اقبالؔ نے زبان کی نزاکتوں اور شکوہ الفاظ کی طرف دھیان دیا۔ اس دور میں داغؔ دہلوی کے مخصوص رنگ سخن اور انداز فکر کی جھلکیاں ان کے یہاں دکھائی دیتی ہیں اور جب انہیں غزل گوئی پر عبور حاصل ہوگیا تو انہیں بلندیوں کی تلاش ہوئی اور وہ غیر شعوری طور پر غالبؔ کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ اقبالؔ کی غزل گوئی کا تیسرا مرحلہ تھا، مگر غالبؔ کی غزل گوئی بھی اقبالؔ کی منزل مقصود نہ بن سکی۔ غالبؔ کا رنگ وآہنگ اقبالؔ کی غزل گوئی پر اثر انداز نہ ہوسکا۔ غالبؔ نے عشق مجازی اور محبوب کے ظاہری حسن کو سامنے رکھ کر اشعار کہے جب کہ اقبالؔ نے اس کے حقیقی اور زندگی کے اسرار ورموز اور فلسفہ حیات کے پوشیدہ رازوں کو اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالا ؎

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وَا کرے کوئی
عذر آفرین جرم محبت ہے حسن دوست
محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

''بانگ درا'' کے حصہ دوم وسوم کی پندرہ غزلوں میں اقبالؔ کا رشتہ غالبؔ سے ٹوٹ چکا ہے۔ اقبالؔ کی ابتدائی غزلوں میں مخصوص لب ولہجہ کبھی خطیبانہ اور اکثر اوقات بیانیہ انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ غزل گوئی کے چوتھے مرحلے میں پہنچ کر اقبالؔ کی غزلیں فکر وفن کے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہیں ''بال جبریل'' کی غزلوں میں انقلابی رجحان نمایاں ہے اور وہ غزل کے سانچے میں رہتے ہوئے نظم کی سرحدوں سے مل جاتی ہیں۔

چوتھے دور میں اقبالؔ جس طرز تغزل کو اپناتے ہیں وہ غزل مسلسل کا رجحان ہے۔اس قسم کی غزل کی بنیاد رکھنے والے خود اقبالؔ ہیں اور اس کے خاتم بھی وہی ہیں، اس طرح انہوں نے غزل کو ایک نئے انداز اور ہیئت و زبان دونوں اعتبار سے منفرد رکھا ہے۔ ان کی غزل مسلسل میں نظمیت جھلکنے لگتی ہے، اندازہ کریں۔

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی
خودی کی جلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی
کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادہ شرق وغرب
تیغ ہلال کی طرح عیش دوام سے گزر

ابھی تک ہم نے مختلف ادوار اور مراحل میں علامہ اقبالؔ کی غزلوں اور شاعری کے بدلتے معیار کو مختصر طور پر دیکھا اور سمجھا۔اب ہم مجموعی طور پر عنوان کے بموجب علامہ اقبالؔ کی غزلوں کی خصوصیات اور خوبیوں سے کلام کریں گے۔علامہ اقبالؔ کی غزل گوئی کی خوبیوں میں سے ہے کہ وہ الفاظ کی اہمیت وانتخاب پر نظر رکھتے ہیں۔

اقبالؔ الفاظ کے دروبست سے آگاہ ہیں اور ان کو تخلیقی اور بہتر انداز میں برتنا بخوبی جانتے ہیں، اس لئے برمحل و برجستہ اور پرشکوہ الفاظ کے موزوں استعمال سے اشعار میں جان ڈال دیتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ لفظ و معنی دونوں کے باہمی ارتباط کے قائل ہیں دونوں کی ہم آہنگی سے شعر میں صناعی اور معنی آفرینی پیدا کرتے ہیں جو دل ونگاہ کو خیرہ کرتی ہے، سامعتوں کو متاثر کرتی ہے اور بسا اوقات مترنم بھی ہو جاتی ہے، چند اشعار ملاحظہ کریں۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں
میں جو سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اسی طرح ''جبرئیل وابلیس'' کے مکالمے میں بزبان جبرئیل فرماتے ہیں۔

سوز و ساز و درد و داغ جستجو و آرزو
ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو

اور پھر ابلیس کی زبانی یہ اشعار بھی دیکھیں۔

آہ اے جبرئیل واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میرا گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو
جس کو نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں ''تقنطوا'' اچھا ہے یا ''لاتقنطوا''

اور پھر یہ شعر بھی۔

دم زندگی رم زندگی غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

اقبالؔ کی غزلوں کے اوصاف اور خوبیوں میں سے اہم خوبی یہ ہے کہ وہ غزل اور نظم دونوں کو ایک عظیم مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ چونکہ وہ پیام انسانیت کے علمبردار اور فکر و فلسفہ کے امام ہیں، لہٰذا وہ خلوص نیت کے ساتھ آفاقی پیام انسانیت اور اپنے فکر وفلسفہ کو غزلوں اور نظموں کے ذریعے عام کرتے ہیں۔ان کے یہاں خون جگر کی نمود سے فن پارے جنم لیتے ہیں وہ خود کہتے ہیں کہ ع

نقش ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبالؔ کی غزلوں کا ایک جدا رنگ یہ بھی ہے کہ ان کی غزلیں زلف کی قید اور عشق کے دام سے آزاد ہیں۔انہوں نے اپنے انقلابی اور مفکرانہ انداز کے بموجب اپنی غزلوں کو اپنے فلسفیانہ خیالات کی ترسیل کا وسیلہ بنایا ہے۔شاعری سے ان کا مقصد بہتر اخلاق، مشرقی روایات اور صالح فکر کو عوام تک پہنچانا ہے، اسی لئے وہ شاعری کا سہارا لیتے ہیں۔ان کے نزدیک شاعری تفریح کا سامان نہیں بلکہ نشاط روح کا ذریعہ ہے۔ علامہ اقبالؔ شعر و شاعری کے بارے میں ایک خاص نظر اور نظریہ رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اُن کے نظمیں بلکہ اُن کی غزلیں بھی ایک خاص رنگ و روغن کی حامل نظر آتی ہیں اور یقینی طور پر اقبالیات کے مطالعہ میں اُس کی اہمیت اور انفرادیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہے۔ (بقیہ ص ۳۷ پر)

فخرالدین عارفی

Mohammadpur, Shahganj, Patna-800006 (Mob.9234422559)

واقفؔ عظیم آبادی اور واقف آرٹ

دبستان عظیم آباد میں شعروسخن کے مختلف رنگ اور آہنگ ملتے ہیں، ان میں ایک رنگ علامہ سید شاہ واقفؔ عظیم آبادی کا بھی ہے، جو ان کے دوسرے معاصر شعرا سے یکسر مختلف اور منفرد نظر آتا ہے۔ اپنے کلام کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی سب سے الگ اور سب سے مختلف تھے۔ شاہ ہوکر بھی فقیرانہ اور عاجزانہ زندگی ان کو زیادہ پسند تھی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اقتصادی طور پر بہت کمزور ہونے کے باوجود انہوں نے شاہانہ زندگی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے، جس کی کوئی نظیر ملنی مشکل ہے۔ دولت بہت سارے لوگوں کے پاس ہوتی ہے، لیکن دل نہیں ہوتا، سخاوت نہیں ہوتی، وہ بخالت کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتے ہیں، لیکن علامہ سید شاہ واقفؔ عظیم آبادی کی زندگی کی راہیں فقیری سے امیری اور تنگ دستی سے ہوتی ہوئی سخاوت اور امارت کی جانب جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں ان کے قدموں کے نشانات رہ گزر بن پائے ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ وقت اور مستقبل کرے گا، لیکن یہاں پر ہم رمزؔ عظیم آبادی کا یہ خوب صورت شعر حضرت سید شاہ واقفؔ عظیم آبادی کی خدمت میں بطور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے آگے بڑھیں تو شاید بے جا، بے محل، بے موقع اور غلط نہ ہوگا۔

آنے والی نسلیں ہم کو بھول سکیں ناممکن ہے
نقش قدم کے مٹتے مٹتے رہ گزر بن جائیں گے

جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا، حضرت سید شاہ واقفؔ عظیم آبادی کا شعر و سخن کی دنیا میں اپنا ایک مخصوص رنگ و آہنگ ہے، الگ لہجہ ہے، منفرد انداز اور طرز اظہار ہے تو مناسب یہ ہوگا کہ یہاں پر ہم ان کے چند نمائندہ اشعار سے استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں، تاکہ میرے درج بالا دعویٰ کی تصدیق ہو سکے، شاید ہمارے ادب کے سنجیدہ ناقدین اور اکابرین ادب نے ایسے اشعار کو ’’واقف آرٹ‘‘ کا نام دیا ہے۔

مرے اشعار میں منظر کشی بھی ہے، ظرافت بھی
قلم نے کھینچ دی تصویر، جو خاکہ لکھا میں نے

واقفؔ صاحب کے اس شعر کی گہرائی اور گیرائی پر جب ہم سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اردو کی بہترین نثر اور طنز وظرافت کی اعلیٰ ترین شاعری کے نمونے زیر ذہن آکر فکر کی موجوں میں ایک تلاطم پیدا کردیتے ہیں۔ ایک طرف جہاں ہمارا ذہن مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری اور احمد جمال پاشا کی نگارشات عالیہ کے اوصاف کی جانب جاتا ہے، وہیں دوسری جانب ہماری ملاقات طنز و مزاح کے دو بڑے شاعروں سے ہوتی ہے، میری مراد دلاور فگارؔ اور رضا نقوی واہیؔ سے ہے۔

کچھ اور پیچھے جاتے ہیں تو اکبرؔ الہ آبادی کی صدائیں بھی گوش سماعت سے ٹکراتی اور بل کھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، تو یہ ہے واقفؔ عظیم آبادی کا ’’واقف آرٹ‘‘ اور ان کی شعری کائنات کا امتیاز و اختصاص کہ وہ اپنے صرف ایک شعر کے ذریعہ کتنی بڑی بات کہہ گئے ہیں۔ علامہ فضل امام واقفؔ کا خود ان کے تعارف کے لئے شاید اس سے بہتر اور برتر کوئی دوسرا شعر ملنا دشوار اور مشکل ہے۔

ادب اور سیاست کی باہمی ستیزہ کاری ہمیں ہر دور میں ملتی رہی ہے، آج بھی ملتی ہے، لیکن علامہ سید شاہ واقفؔ عظیم آبادی نے سیاست اور ادب کا اپنے فن میں جو حسین امتزاج پیدا کیا ہے، اس کی دوسری نظیر کم ملتی ہے، ملاحظہ کریں ان کا یہ خوبصورت شعر اور اس شعر میں کیا گیا ان کا یہ بڑا دعویٰ۔

زبان سادہ میں رنگینیاں رکھ دیں سیاست کی
مزا آنے لگا دونوں کو جب یکجا لکھا میں نے

پھر واقف صاحب خود ہی اپنے ہی اشعار کی تشریح اور توضیح یوں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آجاتی ہے اخبار میں 'گپ' سے مری وسعت
مجھ کو یہ 'ٹیبل ٹاک' کا ساماں نظر آیا
بے کار ہے، لایعنی ہے دیکھا ہے شب تاریک
جگنو سے جو صحرا میں چراغاں نظر آیا

آپ جب سنجیدگی کے ساتھ واقفؔ صاحب کے ان اشعار کا مطالعہ کریں گے تو یہ سچی اور کھردری حقیقت آپ کے سامنے ضرور آئے گی کہ موجودہ عہد میں سیاست اور صحافت دونوں اپنا معیار کھو چکے ہیں اور ادب کی معنویت بھی اپنا اعتبار ضائع کر چکی ہے، تب ہی تو علامہ واقفؔ سب کو لایعنی قرار دے رہے ہیں، وہ ہر سمت بجھی ہوئی سیاست اور صحافت کی بساط کو ''شب تاریک'' سے تعبیر کر رہے ہیں اور ادب کی روشنی کو حالات کے صحرا میں جگنو سے زیادہ تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جگنو کی روشنی کو ہم صحرا میں اگر چراغاں تسلیم کرتے ہیں تو یہ محض خام خیالی ہوگی، جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوسکتا ہے۔ ادب، سیاست اور صحافت کے تعلق سے ایسا حقیقت پسندانہ اور بے باکانہ اظہار ہمیں دوسرے شعرا کے یہاں کم ملتا ہے۔

آج جب ہم مذہبی میدان یا شعبے پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی انتشار ہی انتشار ہمیں ہر سمت نظر آتا ہے، کہیں عقیدے کے نام پر اور کہیں مسلک کے نام پر، ہم مختلف خیموں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ سید شاہ واقفؔ عظیم آبادی کی نظروں نے ایسے سارے مناظر کو بھی بہت قریب سے دیکھا تھا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ۔

کھڑے ہوئے ہیں قبلہ رخ امام ومقتدی، مگر
ہے دو دلوں کے درمیاں جو فاصلہ نہ پوچھئے

علامہ واقفؔ عظیم آبادی سماج کے ایسے لوگوں سے بھی بہت خائف رہتے تھے جو اپنی دنیاوی دولت اور امارت کے نتیجے میں خدا بن کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے وہ کہتے ہیں ۔

اکتا گئی ہے اپنی طبیعت خدا گواہ
کب تک بتوں کے سامنے سجدہ کرے کوئی

الغرض واقفؔ عظیم آبادی کی شاعری میں ان کے قارئین کو سماج کا ہر رنگ اور معاشرے کی ہر تصویر نظر آتی ہے۔ موضوعات کا حق ادا کرنے میں جو تنوع ہمیں واقفؔ صاحب کی شعری کائنات میں بہت نمایاں طور پر نظر آتا ہے، وہ ان کے ہم عصر شعرا کے یہاں کم کم ہی نظر آتا ہے۔ ان کا یہی وصف انہیں اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز اہمیت کا حامل بناتا ہے۔ شاید اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے واقفؔ صاحب کہتے ہیں ۔

مرے اشعار میں ہے بلبل شیراز کا نغمہ
بہت رنگین لکھا، لیکن بہت سادہ لکھا میں نے
شگفتہ طبع ہوں ہر رنگ ہے باغ و بہار اپنا
ہر اک مضمونِ خار وگل تر وتازہ لکھا میں نے

علامہ واقفؔ عظیم آبادی کے کلام پر اظہار خیال کرنا چنداں سہل نہیں۔ ان کے ایک ایک شعر میں دانشوری کے عناصر ہمیں کارفرما نظر آتے ہیں۔ خود علامہ واقفؔ عظیم آبادی نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے فن کی تنقید کرنے والوں پر بڑے لطیف پیرایۂ اظہار میں طنز کیا ہے ۔

اس مرد برہنہ کو بھی تنقید کی سوجھی
مجنوں کو مرا چاک گریباں نظر آیا

یہی وہ فن ہے علامہ واقفؔ عظیم آبادی کا جس کو اگر آپ چاہیں تو ''واقف آرٹ'' کا نام دے سکتے ہیں، بقول واقفؔ عظیم آبادی ۔

ملی جلی حقیقتوں کا نام، واقف آرٹ، ہے
الگ الگ نہ پوچھئے ، جدا جدا نہ پوچھئے

خلاصہ یہ کہ علامہ سید شاہ واقفؔ عظیم آبادی ایسے باکمال شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، جن کے ذکر کے بغیر دبستان عظیم آباد کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ اُن کی پیدائش ۱۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو اردول جہان آباد میں ہوئی تھی۔ وہ ایک طویل مدت تک آرہ میں بھی قیام پذیر رہے، اسی مناسبت سے بعض حضرات انہیں واقفؔ آروی بھی لکھتے ہیں۔ علامہ واقفؔ کا اردو اخبارات سے ان کا بہت گہرا اور قریبی تعلق تھا۔ ان اخبارات میں خاص طور پر ''سنگم'' اور ''صدائے عام'' کا نام نمایاں اہمیت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اردو اخبارات سے بھی ان کی گہری وابستگی تھی۔ ان کا انتقال ۶ رستمبر ۱۹۹۳ء کو تقریباً ۷۸ سال کی عمر میں ہوا اور آرہ میں ہی ان کو ان کے آبائی قبرستان میں ۷ ستمبر ۱۹۹۳ء کو دفن کیا گیا۔ ❁❁

ڈاکٹر ندیم احمد

C-36/5, Lane No.2, R.K.Marg, Chauhan Banger, Delhi - 110053

آزادی کے بعد اردو شاعری پر جدیدیت کے اثرات

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے ساتھ ہندوستانی عوام کو مسرت وغم کے ملے جلے احساسات سے دو چار ہونا پڑا۔ ایک طرف جہاں انگریزی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی خوشی تھی، وہیں دوسری جانب ملک کے تقسیم ہوجانے کا رنج بھی تھا۔

یہ تلخ تجربہ ہر حال میں عوام کو برداشت کرنا ہی تھا، چنانچہ اردو شعرا نے اس آزادی کا استقبال بھی کیا اور اس کا ماتم بھی منایا۔ آنند نرائن ملاؔ، مجازؔ اور جوشؔ جیسے شعرا اُس طبقہ میں تھے، جس نے اس آزادی کا استقبال اور اس پر اپنی خوشی کا والہانہ انداز میں اظہار کیا۔ اسی مستی کے عالم میں جوشؔ نے ''ترانہ آزادی'' نامی نظم لکھ کر اپنے جذبات کو پر مسرت انداز میں پیش کیا، مگر جلد ہی وہ اس جھوٹی آزادی کی حقیقت سمجھ گئے، لہٰذا ''ماتم آزادی'' نامی نظم لکھ کر اسی آزادی کا ماتم بھی کرنے لگے۔ اس کا اثر اردو کے ایک دوسرے شاعر فیضؔ پر بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور وہ اپنی نظم ''صبح آزادی'' میں یہ کہنے کو مجبور ہوگئے کہ یہ وہ سحر نہیں ہے جس کی آرزو لے کر ہم ہندوستانی چلے تھے۔

آزادی پر اپنے نظریات اشتراکی ذہن رکھنے والے چند ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں نے سب سے پہلے ظاہر کیا تھا اور ان کا یہ عقیدہ ہو چلا تھا کہ یہ حقیقی آزادی نہیں بلکہ ایک مصنوعی آزادی ہے۔ ہندوستان میں کمیونسٹ نظریات کے حامیوں نے اسے جھوٹی اور غیر مکمل آزادی کہہ کر سماجوادی نظام کو قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ مارکسی نظریات کے حامی تو اس سے بھی آگے بڑھ کر اس بات کی تشہیر میں لگ گئے کہ جسے ہم آزادی کہہ کر رقص کرتے ہیں وہ دراصل ایک حسین دھوکا ہے، کیونکہ اس آزادی سے تو صرف اتنا ہی ہوسکا کہ نظام بیرونی لوگوں سے چھوٹ کر ایسے مقامی لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جو اپنے تفریقی نظریات کے لحاظ سے ان گوروں سے کسی درجہ بھی کم نہیں۔ مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے ساتھ اب بھی لوٹ کھسوٹ، ناانصافی، ظلم، جبر اور استحصال کا دور دورہ ہے۔ علی سردار جعفری نے اس وقت نظم ''آزادی، آزادی'' لکھ کر آزادی کا جشن منانے والوں سے بیحد سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا تھا ؎

کون آزاد ہوا......؟
کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی؟
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرے پہ اُداسی ہے وہی

دراصل اس دور کے ترقی پسند شعرا کا یہ خیال تھا کہ جب تک ہمیں سماجی اور معاشی جکڑ بندیوں سے نجات نہیں مل جاتی تب تک آزادی بے معنی ہے۔ آزادی کا مطلب ومقصد غریب اور مظلومین کے استحصال کا مکمل خاتمہ ہونا چاہیے اور جب تک یہ استحصال ختم نہیں ہوتا عوام کا ایک بڑا طبقہ غلام ہی بنا رہے گا۔ اختر الایمان نے اس جانب ''۱۵/اگست'' نامی نظم میں بہت واضح طور پر اپنے مشاہدات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے مطابق حالات اب بھی غلامی کے دنوں جیسے ہی ہیں، وہی استحصال اور ناانصافی کا دور اب بھی ہے ؎

وہی کسمپرسی وہی بے حسی ہر طرف کیوں طاری ہے
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں
ابھی تو وہی رنگ محفل، وہی جبر، ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھ کو لے کے آئے ہو، یہ وادی راہ تھی میری منزل نہیں

اس مصنوعی اور نامکمل آزادی کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں ایک ایسا المیہ بھی پیش آیا جو ہمارے ملک کے لئے غیر فطری تھا کیونکہ یہ آزادی ہمیں فرقہ واریت کے زیر اثر لے آئی۔ اس کی حصولیابی کے لئے عوام کو اس وحشت ناک فساد کا سامنا کرنا پڑا جو ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ دنیا کی

تاریخ میں بھی ایک بدنما داغ کہا جاتا ہے۔لوٹ،قتل وغارت،عصمت دری اور انسانیت سوزی کا ایسا خوفناک منظر دیکھ کر حیوانیت تک کی روح کانپ اٹھی ۔اس سلسلے میں پیش رفت کرتے ہوئے اردو شعرا نے امن وامان قائم رکھنے اور اتحاد و بھائی چارہ کو برقرار رکھنے کی غرض سے کئی معنی خیز اور جذباتی نظمیں لکھیں۔اختر الایمان نے ''آزادی کے بعد'' نامی نظم میں ہندوستان کی ان ماؤں سے جو بہادر بیٹے پیدا کرنے کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں، یہ سوال کیا تھا کہ تم نے ان ناگوں کو دودھ کیوں پلایا جنھوں نے ملک کے اتحاد،چین وامن،سکون، گنگا جمنی تہذیب اور بھائی چارگی کا قتل کردیا ۔

تمہارے سپوتوں نے اے ماؤ ، بہنو!
جو کل تھے معصوم اور بھولے بھالے
تمہارے ہی محرم پہ کیوں ہاتھ ڈالا
یہی تھے تمہارے فغاں سننے والے؟
اگر جانتی تھیں مآل محبت
تو کیوں اپنے ہی دودھ سے ناگ پالے

اس طرح ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے بھی پنجاب کے فساد اور تقسیم کے سانحہ پر بہت دل سوز نظم لکھی جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں نہ صرف ملک تقسیم ہو گیا بلکہ اس نے زندگی کی تمام چیزوں کے علاوہ دلوں کو بھی الگ تھلگ کردیا۔

اور نتیجے میں ہندوستاں بٹ گیا
یہ زمیں بٹ گئی، آسماں بٹ گیا
طرز تحریر ، طرز بیاں بٹ گیا
ہم نے دیکھا جو خواب اور ہی تھا
اب جو دیکھا تو پنجاب اور ہی تھا

آزادی حاصل کرنے کے بعد اگرچہ ملک نے مشکل دن دیکھے،مگر کچھ عرصے بعد جمہوری نظام نے عوام کو ترقی کی راہ پر لے جانے کا احساس دلایا۔اس بدلتے دور میں شاعروں کا ذہن بھی ملک کے سماجی اور معاشی مسائل کی جانب متوجہ ہوا۔آزادی کی روشنی میں شاعروں نے جہاں زندگی کے حقائق کی تلاش میں اپنے ذہن ودل کے ساتھ خود کو بھی مصروف کرنا شروع کیا، وہیں کچھ وقت ملک کو خوشحال بنانے والے ذرائع اور طریق کار کو حاصل کرنے کی جستجو میں بھی صرف ہوا۔ان کی نظر اب ان مسائل پر بھی تھی جو ملک کی ترقی اور سالمیت میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس منظر وپس منظر میں ۱۹۵۰ء کے بعد اردو نظم کا ایسا جدید دور شروع ہوا جس میں شعرا کی بصیرت اور آگہی اس نئی دنیا یا نئے زمانے کے لوگوں کی زندگی کے اردگرد اپنے موضوعات کا محور ومرکز بنائے ہوئی تھی۔نیا دور،نئی زندگی اور تازہ نوید کے ساتھ آزاد ہندوستان کی ترقی کا سفر شروع ہوا۔اس بصیرت اور فکر انگیزی نے اردو نظم کو نئے تحرک و تبدل کے طور پر پیش کیا جسے جدید نظم کی تحریک کہا جاتا ہے۔

اردو میں نئی یا جدید نظم کی تحریک سے پہلے ن۔م۔راشد جیسے شعرا کا جوز ور واثر رائج ہو چکا تھا اسے اس تحریک نے بہت کمزور یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ختم کر دیا تھا۔جدید نظم کے شعرا نے لارینس، جوائس، کامو، ینگ وغیرہ کے علاوہ اینگری ینگ مین، بیٹس جنریشن اینٹی پوئٹری وغیرہ جیسے مغربی شاعر اور شعری روایتوں سے بھی ترغیب حاصل کی تھی۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان جدید شاعرانہ بصیرتوں کے ساتھ اردو میں جو نظم گو شعرا جلوہ گر ہوئے ان میں باقر مہدی، عمیق حنفی، مظہر، راہی معصوم رضا، خلیل الرحمٰن اور بلراج کومل کافی اہم ہیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی نے ''کاغذی پیراہن''، ''آئینہ خانے میں''، ''نیا عہد نامہ''، عمیق حنفی نے ''سنگ پیراہن''، راہی معصوم رضا نے ''رقص ماہ''، ''اجنبی راستے''، ''اجنبی شہر'' اور بلراج کومل نے ''میری نظمیں''، ''دل کا رشتہ'' وغیرہ شعری مجموعات لکھ کر جدید نظم کو بلندی ومقبولیت عطا کی۔

ندؔا فاضلی کی نظم ''ایک تصویر'' اس ضمن کی ایک نہایت عمدہ نظم کہی جاسکتی ہے جس میں انھوں نے اپنے محبوب کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس میں زندگی کے تمام رنگ روشن نظر آتے ہیں ۔

صبح کی دھوپ
دھلی شام کا روپ
فاختاؤں کی طرح
سوچ میں ڈوبے تالاب
اجنبی شہر کے آکاش

اندھیروں کی کتاب
پاٹھ شالاؤں میں چہکتے ہوئے معصوم گلاب
گھر آنگن کی مہک
بہتے پانی کی کھنک
تم کو دیکھا تو نہیں ہے لیکن
میری تنہائی میں رنگ برنگے منظر
جو بھی تصویر بناتے ہیں
وہ تمہارے جیسی ہے

اِسی قبیل کی دوسری نظموں میں ہم اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' اور بلراج کومل کی نظم ''درد کا لمحہ'' کو بھی شامل کر سکتے ہیں جن میں جدید نظم کی جدید تخلیقیت اور تخیل کی فراوانی کے عنصر کی بہتات ہے، فکر کی بالیدگی ہے اور کچھ نیا تلاش کرنے کی حسرت بھی پوشیدہ ہے۔

جدید نظم کے شعرانے جدید زبان، نئی علامتوں اور جدید تراکیب پر کافی زور دیا اور شاعری میں نظریات کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے بھی نئے نئے تجربات پیش کئے۔ اسی وجہ سے شمس الرحمٰن فاروقی جیسے ناقد کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

''نئی شاعری دل سے زیادہ ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ ایسا اس وجہ سے نہیں ہے کہ دل کو متاثر کرنا مشکل ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ جدید شاعری جذبات کے الجھاؤ کو ٹھوس زبانوں میں ظاہر کرنا چاہتی ہے۔''

اردو کی اس نئی نظم پر ماڈرنزم پوری طرح سے حاوی تھا۔ جدید نظم کے شعرانے زندگی کی مشکلات، اس کے مسائل اور دشوار کن حقائق کو بیان کرنے کے لئے نئی زبان اور نئے فن کا آغاز کیا۔ زندگی کے تلخ تجربات و معاملات کو سمجھنے کے لئے یہ سب ضروری مانا گیا ،مگر ان نئے شعرانے جدیدیت کے نام پر زندگی کی تھکا دینے والی حالتوں کو بیان کرنے کے لئے اس قدر مشکل اور بوجھل نظمیں لکھنی شروع کر دیں کہ عام قاری کی تو بساط کیا، ادبی ناقدوں کے بھی سر انھیں پڑھ کر چکرانے لگے۔ غیر مناسب منظر کشی، غیر ضروری علامتوں اور غیر فطری تراکیب کے استعمال کی کثرت کی بدولت ''جدید نظم'' کے معیار میں کمی آنے لگی اور اس کی تفہیم ایک چیستانی پہاڑ سر کرنے کے مصداق بن گئی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدید نظم میں ان روایتوں کو اور زیادہ تقویت دی جانے لگی۔ ان روایتوں کی تشہیر کا ذمہ پاکستان سے شائع ہونے والے رسائل ''سات رنگ''، ''نصرت'' اور ''سویرا'' کے سر جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس تشہیر کے علمبردار ''شب خون'' اور ''سوغات'' جیسے ادبی جرائد رہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدید نظریات اور نئے شعر وفن کی فکر لیے جن اردو شعرانے ادبی شمع کو روشن کرتے ہوئے اس کی پاسداری کی، ان میں شہریآر، افتخار جالبؔ، زاہدہ زیدی، ول کرن اشکؔ اور حسن کمال کے نام سر فہرست ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد اردو نظم میں جدید نظریات کی ترقی کے ساتھ ساتھ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول سے عوام کو میں بیداری لانے اور اسے حسب ضرورت تجاویزی طور پر پیش کرنے کی فکر بھی پیدا ہوئی۔ اردو نظم جو کبھی تنہائی و یکتائی کا متبادل سمجھی جاتی تھی، وہ آزادی کے بعد ملک کی ترقی کے مختلف ادوار سے اپنا ناطہ جوڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگی تھی۔ اردو کی جدید نظم کے عروج میں اشتراکی مزاج رکھنے والے شاعر بھی کچھ حد تک اپنے نظریات اس میں شامل کراتے رہے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اردو نظم سماجی ضروریات کی بھی عکاسی کرنے لگی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ہندوستان میں جب جمہوری شعور تیزی سے بڑھنے لگا تو اردو نظم میں بھی عوامی مسائل وضروریات کی تصویر کشی کی جانے لگی، ساتھ ہی لوگوں کی ضروریات کی نشاندہی کرنا بھی نظم کے شعرانے اپنا فرض سمجھا۔

درحقیقت آزادی کے بعد اردو نظم وقت اور سماج کی ضرورت سے کچھ اس طرح گھل مل گئی کہ اس نے حالات کے مدنظر خود کو بھی تبدیل کر لیا اور سماجی تناظر میں بھی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہی۔

بلاشبہ آزادی کے بعد اردو نظم کا دائرہ کار بہت وسیع رہا ہے۔ اس میں فرد کی زندگی کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک کے مسائل کا ذکر تو ہے ہی، بین الاقوامی مسائل کے جانب بھی اس کی پوری توجہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو شعرانے چین، کوریا، مصر، ایشیا، ایران، روس اور فلسطین وغیرہ ممالک کے مسائل سے متعلق بھی کئی فکری اور جذباتی نظمیں لکھیں، خاص طور پر فیضؔ نے ''انقلاب روس''، ''ایرانی

طلباء کے نام' اور ''فلسطینی بچوں کی لوری'' نامی جو نظمیں لکھیں، وہ ان کے ادراک وشعور، انسان دوستی اور محبت کے علاوہ امن وسکون کی جستجو کے لئے ان کے حساس نظریات کو بھی عیاں کرتی ہیں۔

آزادی کے بعد اردو نظم سے متعلق ایک حقیقت یہ بھی رہی کہ ان نظم گو شعرا نے سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کو پیش کرنے اور زندگی کی جدو جہد کو گوشہ تحریر بنانے کے لئے نئے موضوعات پر آزادروی کے ساتھ شاعری کی اور نظم کی ہیئت میں بھی نئے نئے تجربے کیے اور ایسا کرتے ہوئے وہ فکری اور شعوری طور پر آزاد رہنے اور آزاد خیالی کے ساتھ چیزوں کو سمجھنے کے اس قدر عادی ہو گئے کہ انہوں نے نظم کو بھی ''آزاد نظم'' بنا ڈالا، جو کافی حد تک مقبول بھی ہوئی، البتہ عطر شاعری یعنی غزل کو نہ تو یہ جدید نظم اور نہ ہی آزاد نظم نقصان پہنچا سکی۔ غزل کی اہمیت حسب دستور آزادی کے بعد بھی اپنی جگہ اسی آب وتاب اور اسی آن بان شان کے ساتھ مسلم رہی۔ فیضؔ، جوشؔ، جگرؔ اور فراقؔ جیسے پرانی نسل کے شعرا نے تو اس عظیم صنف کو گلے سے لگا ہی رکھا تھا، نئی نسل کے شعرا نے بھی اسے اُتنے ہی خلوص کے ساتھ اپنایا اور اس میں نئے نئے موضوعات پیدا کرنے کی سعی کی۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان ابن انشاء، منیر نیازی، ظفر اقبال اور ۱۹۶۰ء کے بعد عادل منصوری، بشیر بدر، ندؔا فاضلی، ول کرشن اور شین کاف نظام نے غزل کے دامن کو اور بھی وسعت دی، ساتھ ہی اس میں موضوعات کے نئے سرچشمے کھول کر اسے لازوال ہی نہیں بلکہ اور بھی مالا مال بنا دیا۔ وطن عزیز کی آزادی کے بعد اردو غزل میں شعرا نے ذاتی تجربات ومشاہدات کی بنا پر عصری مسائل کے ساتھ رومانی معاملات کو بھی پیش کیا۔

شعرا نے ذاتی خوشی اور غم، امید وناامیدی اور محبت و بے وفائی جیسے موضوعات پر غزلیں لکھیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس دور میں رائج سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کو بھی غزل کے سانچے میں ڈھال کر یا یوں کہیں کہ غزل کے روایتی انداز میں، جدیدیت کی چاشنی گھول کر انہوں نے ایک انقلابی تبدیلی پیش کی جس کے لیے فراقؔ کی غزل کی تراکیب سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہیں یعنی کچھ غم دوراں، کچھ غم جاناں، میں تبدیل ہونے لگا جسے اب ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آگے چل کر یہ دونوں غم جذبیؔ، مخدومؔ اور مجروحؔ کی غزلوں میں ایک دوسرے کے اور بھی قریب آتے چلے گئے۔

غزل جسے اب تک محض عورتوں سے یا عورتوں کی باتیں کرنا، تک ہی محدود سمجھا جاتا تھا، وہ اب لامحدود ہو گئی تھی۔ اس جدید غزل میں رومانیت کم اور زندگی سے جڑی دشواریوں، الجھنوں اور ضرورتوں سے سامنا کرنے کی تجاویز زیادہ تلاش کی جانے لگیں۔ غزل میں بھی اب وہ سب کچھ کہا جانے لگا جو کبھی صرف نظم کے لیے ہی مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ ان نئے شعرا نے اردو غزل کو نئی زمین، نئی زبان اور نیا آہنگ وشعور عطا کیا جس میں فکر بھی تھی، سنجیدگی بھی اور متانت بھی۔ یہ موضوعاتی خشکی اور پھیکے پن سے اب مبرا ہو چکی تھی۔ شین کاف نظام کی غزلوں کے یہ اشعار روایتی غزل کے بدلے ہوئے مزاج اور منظر نامے کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے فن میں ہونے والی تبدیلی کو بھی عیاں کرتے ہیں ۔

غم کی ندی میں عمر کا پانی ٹھہر اٹھہرا لگتا ہے
یہ فقرہ جھوٹا ہے لیکن کتنا سچا لگتا ہے
اس بستی کی بات نہ پوچھو اس بستی کا قاتل بھی
سیدھا سادا، بھولا بھالا، پیارا پیارا لگتا ہے

پہلے زمین بانٹی تھی پھر گھر بھی بٹ گیا
انسان اپنے آپ میں کتنا سمٹ گیا
ہم منتظر تھے شام سے سورج کے دوستو
لیکن وہ آیا سر پہ تو قد اپنا گھٹ گیا

آزادی کے بعد سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کی اردو شاعری کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی زمینی شناخت کو قائم رکھنے کے ساتھ ہندوستان ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی ماحول اور اس ماحول میں پیش آنے والے واقعات وحادثات سے خود کو جاذب کر لیا اور یہ ادب کے لیے اور بھی خوش آئند قدم تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس دور کی اردو غزل بھی نظم کے پیش پیش ادبی تقاضے کے عین مطابق یعنی سماج کے ذریعے اور سماج کے لئے اور سماج کی ضروریات کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ❁❁

ڈاکٹر محمد ثاقب انور

Vill.Sarwily, Po. Bara Eidgah, Waya. Kasba, Distt. Purnia 854330

(Mob. 9801261623)

عرفانؔ صدیقی: ایک شاعر، ایک مترجم

عرفانؔ صدیقی جدید اردو غزل کے ایک مشہور شاعر، مترجم اور صحافی کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے جاتے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۳۹ء میں یو پی کے تاریخی شہر بدایوں میں ہوئی اور ۶۵ سال کی کامیاب زندگی گزارنے کے بعد ۱۵ اپریل ۲۰۰۴ء کو انہوں نے اس دارفانی سے کوچ کیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے دادا کے زیر سایہ گھر پر ہوئی تھی۔ وہ اپنے اسکول کے زمانے ہی سے تقریری وتحریری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ صدیقی صاحب کا پہلا مضمون ''پرتھوی راج راسو میں عربی، فارسی الفاظ'' کے عنوان سے ۱۹۵۴ء میں رسالہ ''آج کل'' دہلی میں شائع ہوا تھا، اس وقت وہ نویں کلاس کے طالب علم تھے۔

عرفانؔ صدیقی کو شاعری کا ماحول ورثے میں ملا تھا۔ وہ نو برس کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۹۵۵ء سے ان کی شعری تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر کبھی انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ عرفان صدیقی نے نظمیں بھی لکھی ہیں، ان کی نظموں میں سے ایک نظم جو کہ ''سفر کی زنجیر'' کے نام سے ہے، وہ کافی مشہور ہے۔ عرفان صدیقی کی نظموں سے قطع نظر جہاں تک ان کی غزلوں کا تعلق ہے، اس سلسلے میں شاربؔ ردولوی لکھتے ہیں:

> ''عرفانؔ صدیقی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ وہ غزل میں سوچتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ عرفان صدیقی نے غزل کی شاعری کو زندگی کی شاعری کے طور پر برتا ہے۔ زندگی کی کوئی ایسی بات نہیں جو ان کی غزل میں اپنی پوری جمالیات کے ساتھ نہ مل جائے۔ انہیں غزل پر ایسی قدرت ہے، جو کم لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔''

(ماہنامہ ''نیادور'' لکھنؤ، عرفان صدیقی نمبر اکتوبر نومبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۳)

عرفانؔ صدیقی مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی کے بعد ۱۹۶۰ء-۱۹۷۰ء کے زمانے میں بسلسلہ ملازمت دہلی میں رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی میں ادبی سرگرمیاں خاص طور سے عروج پر تھیں۔ ان کا تقرر اردو پبلیسٹی کے شعبہ میں ہوا تو مشہور شاعر اور ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد اس وقت اردو شعبہ کے صدر تھے۔ ان کے تبادلے کے بعد مشہور ترقی پسند نقاد علی جواد زیدی اس عہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں عرفان صدیقی کو ایک معاون افسر کی حیثیت سے ان دونوں حضرات کے ساتھ کام کرنے کا بہترین موقع ملا۔ ۱۹۷۴ء میں عرفانؔ صدیقی کا دہلی سے لکھنؤ تبادلہ ہوگیا اور دہلی سے رخصت ہوتے وقت جوان کے دل پر گزری اس شعر سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

ابھی کھلا بھی نہ تھا رخت شوق دلی میں
کہ پھر ہمیں کشش لکھنؤ بلانے لگی

عرفانؔ صدیقی کے لکھنؤ تشریف لانے پر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں فطری طور پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، یہاں ان کی کافی پذیرائی ہوئی، انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، مگر لکھنؤ کی دلکشی وخوبصورتی کے باوجود عرفانؔ صدیقی اس ماحول میں بھی اہل دہلی کو نہیں بھلا سکے ؎

خیر دلی میں تو اوراق مصور تھے بہت
لاؤ اس شہر کے گلیوں میں جا کر دیکھیں

لکھنؤ میں انہیں دبستان دہلی کی یاد ستاتی رہتی تھی، جس کا ذکر ان کے اشعار میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس زمانے میں ان کی ایک غزل نے دہلی اور لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔ غزل ملاحظہ ہو ؎

کتنے دلدار تھے ارباب ستم دلی کے
چین ملتا نہیں یاد آتے ہیں غم دلی کے

کتنی بھولی ہوئی یادوں نے سنبھالا دل کو
جیسے پردیس میں ہوں دوست بہم دلی کے
جانے کیوں کوئی سندیسہ نہیں لائی پچھوا
کیا ہمیں بھول گئے اہل کرم دلی کے
چاہے جس شہر میں رہ آئیں مگر رہتے ہیں
زندگی دلی کی ، دل دلی کا ، ہم دلی کے
یوں تو بت خانہ ہے یہ شہر بھی لیکن عرفاؔن
آج تک پھرتے ہیں آنکھوں میں صنم دلی کے

عرفاؔن صدیقی کوشاعری کے علاوہ ترجمہ نگاری کے فن میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔انہوں نے کالی داس کی مشہورنظم ''رتو سمہارم'' کا اردو میں ترجمہ ''رت سنگھار'' کے نام سے کیا جو۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔اس کے علاوہ انہوں نے کالی داس کے ڈرامہ ''مالویکا اگنی متر'' کا اردو میں ترجمہ اسی نام سے کیا، جو۱۹۸۰ء میں شائع ہوچکا ہے۔عرفان صدیقی نے ڈرامے کا ترجمہ اس انداز سے کیا ہے کہ اسے پڑھ کرقاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک طبع زادتخلیق ہے۔بقول نسرین رضوی:

''عرفاؔن صدیقی جہاں اردو کے بلند مرتبت شاعر کی حیثیت رکھتے تھے، وہیں وہ بہترین صحافی اور باصلاحیت مترجم بھی تھے انہوں نے جہاں انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا، وہیں سنسکرت کے مشہور ڈرامہ نگار کالی داس کے مشہور ڈرامہ 'مالویکا اگنی متر' کا اردو میں ترجمہ کر کے اردو کے قارئین کو دوسری زبان کی ڈرامہ نگاری سے روشناس کرایا ہے۔'' (نیادور،عرفان صدیقی نمبر،ص۱۵۹)

عرفاؔن صدیقی کی ترجمہ نگاری پر پروفیسر محمود الٰہی رقمطراز ہیں:

''عرفاؔن صدیقی صاحب ترجمے کے فن کے ماہر ہیں۔ وہ اس سے قبل بھی بعض اچھے ترجمے پیش کر کے اہل فن سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔'مالویکا اگنی متر' میں ان کا فن نقطہ عروج تک پہنچ گیا ہے۔کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ نہیں بلکہ یہ اردو کی کوئی طبع زاد تخلیق ہے۔'' (نیادور،عرفان صدیقی نمبر،ص۱۵۹)

عرفاؔن صدیقی انڈین حکومت کے انفارمیشن بیورو کے علاقائی دفتر کے سرپرست کی حیثیت سے ۱۹۹۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

عرفان صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ ''کینوس'' ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آیا۔اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں ''شب درمیان'' کے نام سے ان کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔۱۹۹۲ء میں ''سات سماوات'' اور ۱۹۹۷ء ''عشق نامہ'' دہلی سے اور ''ہوائے دشت ماریہ'' ۱۹۹۸ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ان کے بڑے بھائی نیاز بدایونی نے ان کے پانچوں مجموعے کو ایک جگہ جمع کر کے کلیات کی شکل میں ''دریا'' کے عنوان سے ۱۹۹۹ء میں پاکستان سے چھپوایا ہے۔عرفان صدیقی کے مختلف مجموعے کا مطالعہ شاعری میں اُن کے وژن اور مرتبے کا احساس دلاتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اُن کے خاص طرز اور فنی وطیرے کی خوبصورت نشاندہی بھی کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی شخصیتیں کم کم ہی عرصہ علم وقلم میں آتی ہیں جو شاعری اور نثر نگاری، خصوصاً کلاسیکی ادب کے تراجم میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیتی ہوں۔عرفاؔن صدیقی جہاں ادب کی ایسی ہی غنیمت ہستیوں میں تھے۔وہ اعلیٰ مناسب پر فائز رہے اور ملازمت کے تقاضوں نے انہیں کبھی دہلی، کبھی لکھنؤ اور کبھی کسی اور دیار میں رکھا، مگر یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کا بیشتر وقت اردو ادب کے دو عظیم مرکزی شہر میں گزرا اور یہ ان کی بے پناہ علمیت اور مطالعہ ومشاہدے کی وسعت ہے کہ انہوں نے ایک طرف اردو ادب کو سنسکرت کے تراجم سے نوازا اور دوسری طرف شاعری خصوصاً غزل کی شاعری میں زندگی، زمانے اور اپنے ذاتی جذبات واحساسات کو نہایت لطافت سے سمو گئے۔ ❁❁

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

محمد ثناء اللہ
251 "Jahlam Hostel" Jawahar Lal Nehru University, New Delhi - 110067 (Mob. 9560878759)

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی بصیرت

مولانا آزاد اپنی ہمہ جہت شخصیت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔علم وسیاست کی جس وادی میں آپ نے قدم رکھا اس پر اپنے انمٹ نقوش ثبت کردیے۔قدرت نے آپ کو خلاقانہ ذہن سے نوازا تھا۔شعور وفکر کے جتنے گوشے آپ کے افکار عالیہ سے روشن ہوئے، وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔اگرچہ بالعموم آپ کو اپنی سیاسی بالغ نظری، علمی وقار اور دینی خدمات کی وجہ سے جانا جاتا ہے، لیکن آپ کی ادبی بصیرت اور ادبی خدمات کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے۔

مولانا آزاد کی ادبی بصیرت کو سمجھنے کی راہ میں مولانا آزاد کی زندگی کے کئی پہلو ہماری مدد کرتے ہیں۔ یہ معلوم بات ہے کہ مولانا آزاد نے سب سے پہلے نہایت کم عمری میں ایک ادبی گلدستہ جاری کیا تھا۔''خدنگ نظر'' کی اہمیت سے اس لیے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہمیں مولانا کے ذہنی اپروچ سے باخبر کرتا ہے۔اس سے بڑی ادبی بصیرت اور کیا ہوسکتی ہے کہ شاعری ایک انسان کے بچپن کا شوق ہو اور تھوڑا بڑا ہوکر وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرلے یہ سوچ کر کہ اس کے لیے نثر زیادہ بہتر پیرایۂ اظہار ہے۔

مولانا کے رسالہ 'لسان الصدق' پر اگر نظر ڈالی جائے تو مولانا کی ادبی بصیرت اور بھی واشگاف ہوکر ہمارے سامنے آتی ہے۔مولانا نے جس طرح ترجمہ کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے، اصطلاحات کے اسرار ورموز سے پردے ہٹائے ہیں اور لسانیاتی گتھیاں جس طرح سے

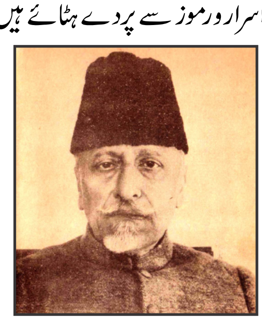

آپ نے سلجھانے کی کوشش کی ہے، اس سے آپ کی علمیت و گیرائی کے ساتھ ہی آپ کی ادبی بصیرت اور ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ ارباب علم ودانش کو پتہ ہوگا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ساتھ حظ وکرب اور درد والم کی بحث کتنی دلچسپ رہی تھی اور اس معاملے میں مولانا کے کٹر نکتہ چیں ماہر القادری نے بھی مولانا کے موقف کی ہی تائید کی تھی۔مولانا کی ادبی بصیرت کے بہتیرے دلکش نمونے ان کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔''الہلال'' اور''البلاغ'' سے لے کر''تذکرہ''،''ترجمان القرآن'' اور''غبار خاطر'' کی ایک ایک سطر آپ کے ادبی ذوق اور لسانی شعور کی غمازی کرتی ہے۔برمحل اشعار کے استعمال کا معاملہ ہو، سجے سجائے نک سک سے درست جملوں کو نگینے کی مانند جڑنے کا معاملہ ہو، اسلوب کی گرمی اور جذبے کی صداقت کا معاملہ ہو یا زبان و بیان کے تجدیدی اور خلاقانہ استعمال کا معاملہ، ہر جگہ آپ کی یہ بصیرت جلوہ گر ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا نے اپنے گہر بار قلم سے جہاں علم ودانش کے کئی گوشے روشن کیے، وہیں زبان و ادب کے گلشن بھی آپ کی نظر عنایت سے محروم نہ رہے۔ابوسلمان شاہجہاں پوری کی تحقیق کے مطابق مولانا نے اردو کے اندر تین سو سے زیادہ الفاظ رائج کئے۔بادی النظر میں اگرچہ یہ بات معمولی سی نظر آتی ہے، لیکن غور کرنے پر اس کی اہمیت وعظمت کا بخوبی احساس ہوتا جاتا ہے۔

زبان وادب کا یہی شعور اور یہی بصیرت تھی جس نے قرآن حکیم کی لازوال تفسیر''ترجمان القرآن'' سے ہمیں نوازا۔یوں تو قرآن کے بہت سے ترجمے ہوئے، لیکن وہ جو کہتے ہیں نا''وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''، رشید احمد صدیقی نے بجا طور پر یہ بات کہی ہے کہ قرآن کے اسلوب وآہنگ کو اگر اردو میں کسی نے منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے تو وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں اور سوچا جاسکتا ہے کہ اس کے لیے کس قدر ادبی بصیرت کی ضرورت ہوگی۔

مولانا پر عام طور سے مشکل پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے اور

عربی، فارسی الفاظ کے بے جا استعمال کا شکوہ کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات تو اس سلسلے میں زبان درازی کے بھی شکار ہو جاتے ہیں، لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ مولانا کا کوئی ایک اسلوب نہیں۔ وہ موقع اور محل کے اعتبار سے اسلوب اپناتے ہیں۔ ''تذکرہ'' علما کے لیے لکھا تو اس زمانے کے علما کے اسلوب و آہنگ میں لکھا۔ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا مقصد امت کو بیدار کرنا اور عمل پر ابھارنا تھا تو اسی لحاظ سے جوش و آہنگ کا سہارا لیا گیا۔ ''ترجمان القرآن'' عام آدمی کے لیے لکھا گیا تو بالکل سلیس اور سادہ زبان استعمال کی گئی اور ''غبار خاطر'' کے اندر دل ونگاہ کی داستان چھیڑنی تھی تو رنگین ادبی اسلوب اختیار کیا گیا اور یہ سب کچھ اگر کسی چیز کا پتہ دیتا ہے تو اس بات کا کہ مولانا کا لسانی زاویہ کتنا روشن اوران کی ادبی بصیرت کتنی پختہ تھی۔ آپ کے دفتری احکامات پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے کس طرح انگلش کے برمحل الفاظ کے استعمال سے اردو کو عام غیر اردو داں افراد کے لیے بھی قابل فہم بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہاں چند مثالوں کے ذریعہ اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ''تذکرہ'' کے اندر مولانا کا جاہ وجلال، زبان وبیان کا جوش وخروش اوران کا عربی فارسی آمیز رویہ دیکھیے:

''پس حقیقت وهی هے جس کو وحی الٰهی اور حاملین منصب نبوت علی الخصوص آخرهم و اعظمهم محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم اور ان کے اصحاب نے دنیا کے آگے پیش کیا اور شك و ظن کی ظلمت و محجوبیت کی جگه علوم سماویه و نبویه کی یقینیات وبراهین کا دروازه نوع انسانی پر کهول دیا اور جس کے علم و عمل کا نمونه سلف صالح و اوائل امت مرحومه من السابقون الاولون من المهاجرین و الانصار والذین التبعوهم باحسان من ورثه الانبیاء و خلفاء الرسل و ائمه الهدی رضی الله عنهم و رضوا عنه نے اخلاف و آخرامت کو همیشه کے لئے دکهلا دیا۔ اولـئك عـلـی هـدی مـن ربهـم و اولـئك هـم المفلحون۔'' (تذکرہ ص ۱۷۷)

کیا ایک یہی عبارت اس بات کے اثبات کے لیے کافی نہیں کہ دراصل اس کتاب کا مخاطب وہ طبقہ علما ہے جس کے اندر عقیدے کی خرابیاں در آئی ہیں، لیکن وہ اپنے کو علم ودانش کے میدان میں پیچھے نہیں سمجھتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ایسے ہی طرز خطاب کی ضرورت تھی، ورنہ وہ اسے درخور اعتنا ہی نہ سمجھتے، لیکن مولانا کا یہی اسلوب ''غبار خاطر'' میں ہمیں نہیں ملتا۔ بلکہ وہاں ایک دوسرا ہی اسلوب ہے:

''میں آپ کو بتلاؤں، میرے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہوسکتا ہے! جاڑے کا موسم ہو اور جاڑا بھی قریب قریب درجہ انجماد کا، رات کا وقت ہو، آتشدان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور میں کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے لکھنے میں مشغول ہوں۔

من این مقام بدنیا و عاقبت ندهم
اگرچه در پیم افتند خلق انجمنی

معلوم نہیں بہشت کے موسم کا کیا حال ہوگا! وہاں کی نہروں کا ذکر بہت سننے میں آیا ہے، ڈرتا ہوں کہ کہیں گرمی کا موسم نہ رہتا ہو۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے، وہ تری جلوہ گاہ ہو

عجیب معاملہ ہے۔ میں نے بارہا غور کیا کہ میرے تصور میں آتشدان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے، لیکن کچھ بتلا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتشدان کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہوا۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا۔ اگر آتشدان نہ سلگ رہا ہو، پھر آتشدان بھی وہی پرانی روش کا ہونا چاہیے، جس میں لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے جلائے جاسکیں، بجلی کے ہیٹر سے میری تسکین نہیں ہوتی، بلکہ اسے دیکھ کر

طبیعت چڑسی جاتی ہے۔‘‘(غبار خاطر،ص۱۷۲)

اب ذرا فیصلہ کیجیے کہ ان دونوں اسلوب میں کس قدر نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ جہاں ’’تذکرہ‘‘ میں گھن گرج اور جوش وخروش کے ساتھ علمیت کی گہری چھاپ ہے، وہیں یہاں گفتگو کا طرز وانداز ہے اور وہ بھی چاشنی اور لطف کے ساتھ۔ کیا اس کے بعد بھی اس اعتراض کو درست سمجھا جاسکتا ہے کہ مولانا کے یہاں لفاظی اور ثقالت کا طومار ہے، ہرگز نہیں اور اگر ’’ترجمان القرآن‘‘ پر ایک نظر ڈال لی جائے تو یہ حقیقت اور بھی روشن ہوجائے گی۔ مولانا لکھتے ہیں:

’’خدا کی سچائی، اس کی ساری باتوں کی طرح، اس کی عالمگیر بخشش ہے۔ وہ نہ تو کسی خاص زمانے سے وابستہ کی جاسکتی ہے، نہ کسی خاص نسل وقوم سے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے۔ تم نے اپنے لیے طرح طرح کی قومیتیں اور جغرافیائی اور نسلی حدبندیاں بنالی ہیں، لیکن تم خدا کی سچائی کے لیے کوئی ایسا امتیاز نہیں گھڑ سکتے۔ اس کی نہ تو کوئی قومیت ہے، نہ نسل ہے، نہ جغرافیائی حدبندی، نہ جماعتی حلقہ بندی۔ وہ خدا کے سورج کی طرح ہر جگہ چمکتی اور نوع انسانی کے ہر فرد کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر تم خدا کی سچائی کی ڈھونڈھ میں ہو تو اسے کسی ایک ہی گوشے میں نہ ڈھونڈھو۔ وہ ہر جگہ نمودار ہوئی ہے اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ تمہیں زمانوں کا، قوموں کا، وطنوں کا، زبانوں کا اور طرح طرح کی گروہ بندیوں کا پرستار نہیں ہونا چاہیے۔ صرف خدا کا اور اس کی عالمگیر سچائی کا پرستار ہونا چاہیے۔ اس کی سچائی جہاں کہیں بھی آئی ہو اور جس بھیس میں بھی آئی ہو، تمہاری متاع ہے اور تم اس کے وارث ہو۔‘‘(ترجمان القرآن، ج۱، ص۴۱۱)

مالک رام ’’ترجمان القرآن‘‘ میں پیش کیے گئے ترجمہ پر ’’کچھ ابوالکلام کے بارے میں‘‘ میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

’’یہ ترجمہ ادبی لحاظ سے بھی اتنا حسین اور برجستہ ہے کہ اسے ادبی تخلیق کا درجہ دیا جانا چاہیے تھا۔ افسوس کہ اس پہلو سے کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ مثال کے طور پر صرف سورہ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

’اللہ کے نام سے جو الرحمان الرحیم ہے۔‘

’ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے، جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے، جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔ (خدایا!) ہم پر سعادت کی سیدھی راہ کھول دے، وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے۔‘ اس پر ترجمہ کا گمان ہی نہیں ہوتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مصنف نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے اسے اصل میں لکھا ہی اس طرح ہو۔‘‘(کچھ ابوالکلام کے بارے میں، ص۸۳)

مولانا آزاد کا اسلوب ضرورتوں اور مواقع اور محل کے اعتبار سے بدلتا رہا ہے اور جس مصنف اور ادیب کو اس کی قدرت ہو اور سامعین کی سمجھ کے مطابق باتیں رکھنے کا جسے گر آتا ہو اس کی ادبی بصیرت کا کیا کہنا! مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی بصیرت کی اس بحث کو ہم مولانا کے اس اقتباس پر ختم کرنا چاہیں گے جس کے اندر مولانا کا لسانی شعور بھی جلوہ گر ہے اور ادبی نیرنگی بھی۔ اصطلاح ’’وظائف‘‘ کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

’’اصل عبارت میں لفظ function ہے۔ انگریزی میں فنکشن اور ڈیوٹی دو ایسے لفظ ہیں جن کے معنی اگرچہ متحد ہیں مگر محل استعمال مختلف ہے۔ عربی میں فنکشن کے لیے بحالت مفرد ’وظیفہ‘ اور بحالت جمع ’وظائف‘ آتا ہے۔ ڈیوٹی کے لیے بحالت مفرد ’واجب‘ اور بحالت جمع ’واجبات‘ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اردو میں فنکشن اور

(بقیہ ص ۳۴ پر)

سعدیہ بانو
Shahpur, Baghoni, Fazeelpur, Near Jama Masjid, Samastipur (Bihar)

نیاؔز فتح پوری: ایک عظیم صحافی

اردو ادب وصحافت کی تاریخ میں نیاؔز فتح پوری کا نام بہت ہی احترام سے لیا جاتا ہے۔ان کی کتاب زندگی کا آغاز اگر چہ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہوا،لیکن ان کی ادبی زندگی یوں کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے شروع ہوئی اور کم وبیش یہی زمانہ ہے جب کہ انہوں نے صحافت کی دنیا میں بھی قدم رکھا، یہاں تک کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں، انہیں اپنا رسالہ نکالنے کی سعادت ملی۔اس رسالہ کو علمی دنیا''نگار'' کے نام سے جانتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نیاؔز فتح پوری اگر چہ کالج اور یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیمی اسناد نہیں رکھتے تھے۔وہ عام زبان میں یوں کہا جائے کہ صرف میٹرک پاس تھے،لیکن قدرت نے انہیں بے پناہ خصوصی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔وہ ایک ہمہ جہت علمی شخصیت کے مالک تھے۔غلط نہیں کہا گیا ہے کہ وہ ایک شاعر بھی تھے،افسانہ نگار بھی، ناقد ومورخ بھی،مترجم و صحافی بھی اور ایک جید عالم بھی۔ بلا شبہ وہ علم کا سمندر تھے اور کوہ شکن افکار کے مالک۔

نیاؔز فتح پوری کی زندگی اوران کے علمی کارناموں کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب اسلوب نثر نگار، بالیدہ سیاسی شعور رکھنے والے ادیب، جنسیات وعمرانیات کے ماہر تجزیہ نگار، ایک بالغ نظر ادبی ناقد اور مذہبیات ولسانیات کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھنے والے فن کار تھے۔فی الواقعہ ان کی ادبی وعلمی شخصیت کا ایک ایک پہلو ایسا ہے کہ اس پر کئی کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں،لیکن یہاں آج کی تھوڑی سی فرصت میں،ہمیں جس پہلو پر اجمالاً اظہار خیال مطلوب ہے، وہ ہے ان کی ادبی صحافت۔بلاشبہ ایک عظیم صحافی اور خصوصاً رسالہ''نگار'' کے مدیر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ انتہائی بلند ہی نہیں، ادبی صحافت کی تاریخ میں منفرد اور بے مثل بھی ہے۔ یہ رسالہ ان کی ادارت میں مختلف شہروں سے مختلف وقتوں میں نکلتا رہا۔تاج کی دھرتی سے، ل۔احمد کی تحریک پر اس کی شروعات ہوئی۔گیارہ مہینے کی مدت یہاں گزار کر پھر چار سال چھ مہینے تک یہ بھوپال سے اشاعت پذیر ہوتا رہا، بعد ازیں پینتیس سال تک لکھنو سے اس کی اشاعت عمل میں آئی اور اس کے بعد جب نیاؔز نے ترک وطن کیا تو تقریباً چار برسوں تک، یعنی نیاؔز کی رحلت کے ماہ وسال تک یہ کراچی سے بنام''نگار پاکستان''منظر عام پر آتا رہا۔

یقیناً اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ رسالہ''نگار'' نے نہ صرف یہ کہ نیاؔز فتح پوری کے نام کو بہت بلندی تک پہونچایا بلکہ اس نے اردو ادبی صحافت کو بھی ایسے مقام ارجمند سے آشنا بنا دیا جو بجائے خود ایک منفرد مثال ہے۔

نیاؔز فتح پوری درحقیقت ایک دیدہ ور اور نباض وقت صحافی تھے اور قدرت نے اس کام کے لئے انہیں خاص ذہنی صلاحیت، علمی استعداد اور قرطاس وقلم کی قوت عطا کی تھی۔وہ اس اعتبار سے یقیناً اپنی مثال نہیں رکھتے تھے کہ جب جو چاہتے وہی اپنے قارئین کی نذر کرتے تھے، یہاں تک کہ جب چاہتے''نگار'' کا پورے کا پورا شمارہ بلا شرکت غیرے بقلم خویش لکھ دیا کرتے تھے اور فرضی ناموں سے بھی کام لیتے تھے تو اس میں صحافیانہ جادوگری اپنے شباب پر ہوتی تھی۔

اس عظیم صحافی کے تحریر کردہ نہ جانے کتنے ہی عمومی وخصوصی شمارے ایسے ہیں جن کی اہمیت با قاعدہ کسی مطبوعہ کتاب سے کم نہیں۔ ''ملاحظات نمبر''،''قرآن نمبر''،''غالبؔ نمبر''اور''فرماں روایان اسلام نمبر''غرض کہ خصوصی نمبروں کی ایک کہکشاں ہے جو''نگار'' کی دستاویزی رونق آج بھی دوبالا کر رہی ہے۔اس کے علاوہ''خدا نمبر''،''پاکستان نمبر''،''معلومات نمبر''،''مومنؔ نمبر''،''بہادر شاہ ظفرؔ نمبر''،''نظیرؔ نمبر''، ''اردو شاعری نمبر''،''ہندی شاعری نمبر''،انتقاد نمبر''،''معاصر شعرا نمبر''،

''افسانہ نمبر''، ''تنقید نمبر''، ''داغ نمبر''، ''حسرت نمبر''، ''اصناف سخن نمبر'' اور ''جدید شاعری نمبر'' غرض کہ خصوصی نمبرات کا ایک شاندار سنہری سلسلہ ہے اور اتنی بڑی تعداد میں ہے کہ نہ جانے کتنے ادبی رسائل اس زمانے میں کیا، آج بھی قاعدے سے اتنے عام شمارے نکالنے کی حسرت لئے دم توڑ جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ ''نگار'' کے حوالے سے نیاز کی ادبی صحافت، ہماری تاریخ صحافت کا ایک محیر العقول باب ہے۔

اردو صحافت ظاہر ہے کہ روز نامہ نگاری سے قطعاً مختلف نوعیت رکھتی ہے۔ اگر چہ یہ بھی ایک قسم کا ارتجالی ادب ہی ہے، لیکن کچھ خاص وقفہ اور اسی لحاظ سے ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ادبی موضوعات پر تنقید و تبصرہ، ادبی شخصیتوں کا تجزیہ، ادبی مطبوعات کی جانچ پرکھ اور ان کی تحقیق، نیز ادبی اصناف کی شکل میں متنوع تخلیقی نگارشات ہی کا نام ادبی صحافت ہے۔ بیشک ایسا سمجھنا یکسر غلط نہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ادبی صحافت اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔

ادبی صحافت کا خاص وظیفہ یہ ہے کہ وہ مخصوص مزاج کے توسط سے باسلیقہ اور فکر مند قاری کو ادبی شعور سے مالا مال کرتی ہے۔ ادبی صحافت ادب کے بے شمار گوشے وا کرتی اور نہ جانے کتنے ہی بھولے بسرے ادبی موضوعات و مباحث کی بازیابی ممکن بناتی ہے۔ تحقیق و تنقید وہ چیز ہے جس سے ادبی صحافت میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے اور یہی چیز قاری کو علم وفن سے بہرہ ور اور مسرت و بصیرت سے آشنا کرتی ہے، یہاں تک کہ اس میں ادب اور مطالعہ ادب سے ایک خاص لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے اندر روز بروز علمی ذوق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں یک گونہ معاملہ قاری کی ذہنی و فکری تطہیر و تربیت کا ہوتا ہے۔ ادبی ذہن سازی اور ذوق پروری کا یہ کام یقیناً بڑا ہی نازک کام ہے اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کام کو جس قدر دل جمعی، محنت اور محبت کے ساتھ نیاز فتح پوری نے انجام دیا ہے اور ادبی صحافت کے تمام زریں اور ضروری اصولوں کی انہوں نے جس خصوصی شعور کے ساتھ پاسداری کی ہے اس کی مثال تقریباً نایاب ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج سے نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ایک بلند پایہ صحافی کی حیثیت سے نیاز فتح پوری کا اور ایک بے مثل ادبی رسالہ کی حیثیت سے ماہنامہ ''نگار'' کا نام زندہ تابندہ ہے۔

روز نامہ نگاری میں کسی موضوع پر خبروں کی اشاعت یک گونہ داخلی ربط چاہتی ہے اور سیاسی تبصرے بسا اوقات تجسس کی فضا بناتے ہیں، اسی طرح ادبی صحافت میں بھی یک گونہ تجسس کی برقراری اہمیت سے خالی نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قاری کی توجہ ادبی صحافت سے ٹوٹنے نہیں پاتی ہے اور اس کے لئے کچھ خاص طرز و اسلوب، کچھ خاص گوشہ بیان اور موضوعی تنوع سے کام لینا پڑتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ نیاز جیسے صحافی نے ہمیشہ ہی اس پہلو کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ ''نگار'' کے ''جگر نمبر'' میں نیاز نے جگر پرستی کے بت کو جس طرح طرح پاش پاش کیا ہے، وہ مذکورہ پہلو کی ایک واضح مثال ہے۔

نیاز فتح پوری کے یہاں اگر ایک طرف ادبی صحافت میں مشرق سے مستجابی کو اختیار کرنے کا وصف ملتا ہے تو دوسری طرف مغرب کی احتسابی کو قبول کرنے وصف بھی ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورتحال نے ان کے یہاں ایک خاص توازن لا دیا ہے۔ نیاز کی صحافت پر یوروپ نوازی کے چاہے کتنے ہی الزام رکھے جائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یوروپ کے فلسفہ ادب سے اردو والوں کو واقفیت دلانے میں ''نگار'' کی اہمیت و تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نیاز فتح پوری کی صحافتی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ نکتہ چینی اور حاشیہ آرائی کی بجائے، حسب توفیق حقیقت کی گرہ کشائی اور فن کی بلندی و باریکی سے آشنائی پر توجہ دیتے ہیں اور ایسے اسلوب میں لکھتے ہیں جو دلوں میں جگہ پا لیتا ہے۔ نیاز نے ایسے دور میں اپنے لئے ادبی صحافت کی راہ منتخب کی جب کہ سیاسی صحافت سے وابستگی کے امکانات سہل اور قرین ماحول تھے اور بیشک ان کا یہ فیصلہ اور اس پر استقامت اور اس میں کامیابی ان کی عظمتوں کی دلیل ہے۔ بیشک وہ صحافت کی دنیا میں عبقری شخصیت کے حامل تھے اور انہوں نے ''نگار'' کی صورت میں اپنی ایسی یادگار چھوڑی ہے جس کے نہ جانے کتنے ہی پہلو آج بھی ہمیں بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع دینے کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

عروضیات

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم
Vill. Rajpur, P.o. Sabour, Dist. Bhagalpur - 813210 (Mob. 6205628961)

تسکین اوسط اور تخنیق کے رموز

علم عروض اُس علم کا نام ہے جس کے ذریعے اشعار کے اوزان معلوم کئے جاتے ہیں۔ دوسرے تمام علوم کی طرح علم عروض کے بھی کچھ قواعد وضوابط ہیں۔ شعر کی موزونیت کے لئے علم عروض کے قواعد وضوابط کی پابندی لازمی ہے۔ اس علم کے ذریعے کلام موزوں کی بحر متعین کی جاتی ہے۔ علم عروض کے موجد یا بانی ابوعبدالرحمٰن خلیل بن احمد بصری ہیں جن کا زمانہ دوسری صدی ہجری تھا۔

عروض عربی زبان کا لفظ ہے اور لغت میں اس کے متعدد معنی درج ہیں۔ اس لفظ کا ایک معنی ''مکہ اور مدینہ'' بھی ہے۔ ''بحرالفصاحت'' میں نجم الغنی رامپوری نے علم عروض کی کئی وجہ تسمیہ بیان کی ہیں۔ ان کے بیان کردہ وجہ تسمیہ میں ایک یہ ہے کہ:

''خلیل بن احمد نے جب یہ علم ایجاد کیا تو وہ مکہ میں تھا، سو تبرکاً اس شہر کے نام سے اس علم کو منسوب کیا۔''

دوسرا خیال یہ ہے کہ:

''اس علم کو عروض اس لئے بھی کہتے ہیں کہ اس پر شعر کو عرض کرتے ہیں یعنی شعر کو اس پر جانچتے ہیں تاکہ موزوں و ناموزوں علاحدہ ہو جائے۔''

میری نظر میں متذکرہ دونوں اقوال بقیہ اقوال سے انسب اور معقول ہیں۔

جدید تحقیق سے ثابت ہوا کہ خلیل بن احمد نے جو ریاضی، موسیقی اور سنسکرت سے بھی واقف تھا، یونانی اور قدیم عربی طریقوں کی آمیزش سے پندرہ بحور اور پانچ دائروں کو ایجاد کیا۔ اس تحقیق کی تائید البیرونی کی ''کتاب الہند'' سے بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی کتاب ''رموز شاعری'' کے صفحہ نمبر ۲۳ پر اس کا ذکر کیا ہے۔ علمائے عروض کے مطابق خلیل بن احمد کی ایجاد کردہ پندرہ بحور کے بعد ایرانیوں نے چار مزید بحور کا اضافہ کیا اور یہی کل اُنیس سالم بحور آج تک رائج ہیں۔

ان انیس سالم بحور میں چند بحریں مفرد سالم اور چند مرکب سالم بحور ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی زبان کے شاعروں نے اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق اپنی پسند کی کچھ مخصوص بحروں ہی کا استعمال کیا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ مذکورہ انیس سالم بحور پر مختلف زحافات کے عمل سے متعدد بحور وجود میں لائی گئی ہیں۔ ان مزاحف بحروں کی تعداد میری معلومات کے مطابق سیکڑوں میں ہے۔

تحقیق کے مطابق علم عروض پر پہلی مستقل کتاب تیسری صدی ہجری میں ابواسحاق زجاج نے لکھی، لیکن اس موضوع پر سب سے مشہور کتاب شمس قیس رازی کی ''المعجم'' اور محقق نصیرالدین طوسی کی ''معیارالاشعار'' ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے مطابق علم عروض پر ایک کتاب شہنشاہ بابر نے بھی لکھی تھی۔

اردو میں علم عروض پر سب سے معتبر کتاب نجم الغنی رامپوری کی ''بحرالفصاحت'' ہے جو پانچ حصوں پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ علم عروض سے متعلق ہے۔ ۱۹۲۴ء میں نجم الغنی نے ''بحرالفصاحت'' میں مختلف ترمیم و اضافے کے بعد اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا اور تاحال یہی ایڈیشن رائج اور دستیاب ہے۔ اردو میں اس موضوع پر دوسری اہم ترین کتاب یاسؔ، یگانہؔ چنگیزی کی ''چراغِ سخن'' ہے جو پہلی بار ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی، اسی سلسلے کی ایک کڑی مولانا حسرتؔ موہانی کا رسالہ ''معائب سخن'' بھی ہے۔

''معائب سخن'' پہلی بار ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ احمد لاری کے مطابق حسرتؔ موہانی نے اسے ۱۹۴۱ء میں کانپور سے دوبارہ شائع کیا تھا۔ مولانا نے اس رسالے میں شعر کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی ہے۔ اسی رسالے میں مولانا کی دریافت کردہ اصطلاح ''شکست ناروا'' کی تفصیل بھی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اپنی کتاب ''عروض، آہنگ اور

بیان''میں رقمطراز ہیں کہ:

"شکست ناروا کی دریافت 'معائب سخن' کا بہترین کارنامہ ہے۔"

اس وقت''شکست ناروا''میرے بحث کا موضوع نہیں ہے،اس لئے میں اس کی تفصیل میں نہیں جارہا ہوں،البتہ اس کی تعریف وتفصیل کے لئے حسرت موہانی کی''معائب سخن''یا شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب''عروض، آہنگ اور بیان'' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔یہاں میں نے بر سبیل تذکرہ شکست ناروا کا ذکر صرف اس کی اہمیت کے پیش نظر کیا ہے۔

اردو میں علم عروض کے موضوع پر دور حاضر میں لکھی جانے والی کتابوں میں شمس الرحمٰن فاروقی کی''عروض، آہنگ اور بیان'' کمال احمد صدیقی کی''عروض''پرفیسر عنوان چشتی کی کتاب''عروضی اور فنی مسائل''اور پروفیسر عظیم الرحمٰن کی کتاب''کتاب العروض''ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔

اردو میں مفرد سالم بحور کی تعداد صرف سات ہے۔بحر ہزج جس کا سالم افاعیل مفاعیلن ہے،بحر رمل جس کا سالم افاعیل فاعلاتن ہے،بحر رجز جس کا سالم افاعیل مستفعلن ہے،بحر متقارب جس کا سالم افاعیل فعولن ہے،بحر متدارک جس کا سالم افاعیل فاعلن ہے،بحر کامل جس کا سالم افاعیل متفاعلن ہے اور بحر وافر جس کا سالم افاعیل مفاعلتن ہے۔ان سات سالم بحور میں فعولن اور فاعلن خماسی افاعیل ہیں اور بقیہ اور پانچ سباعی افاعیل ہیں۔عروض دانوں نے بعض عروضی اور فنی قباحتوں کو دور کرنے کی غرض سے پانچ ثمانی افاعیل بھی ایجاد کی ہیں جو نہایت خوش آہنگ بھی ہیں اور قابل استعمال بھی، مثلاً مفاعلاتن (بحر جمیل) مفتعلاتن (بحر نہال) وغیرہ وغیرہ۔ہمارے شعرا دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ان بحور میں بھی اشعار نظم کرتے رہے ہیں، مثال کے طور پر میر تقی میر کا درج ذیل مقبول ومعروف شعر ؎

نا حق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن مفعولن

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

مفتعلاتن مفتعلاتن مفتعلاتن مفتعلن

یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، اس لئے میں اپنے اصل موضوع کی جانب لوٹتا ہوں، لیکن اس امر کی وضاحت کر دینا یہاں ضروری ہے کہ میر تقی میر کے محولہ بالا شعر میں تسکین اوسط کا استعمال ہوا ہے جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔بہرحال انہی سات سالم بحور کے افاعیل پر مختلف زحافات کا استعمال کرکے سینکڑوں اوزان بنائے گئے ہیں۔ان میں دو بحریں یعنی بحر وافر مفاعلتن اور بحر کامل متفاعلن کے افاعیل پر زحاف تسکین اوسط کا استعمال ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ تسکین اوسط کا استعمال اسی حالت میں ممکن ہے جب کسی افاعیل (سالم یا مزاحف) میں تین متحرک حروف ایک جگہ پر موجود ہوں جیسے کہ بحر وافر کے سالم افاعیل مفاعلتن میں ع،ل اور ت تینوں متحرک حروف ایک جگہ پر ہیں اور لگاتار ہیں ایسی صورت میں ضرورت شعری کے تحت درمیان کے حرف''ل''کو ساکن کرکے اس کے پہلے والے حرف سے ملا دیا جاتا ہے۔مفاعلتن پر تسکین اوسط کے استعمال کے بعد جو نیا وزن نکلتا ہے وہ مفاعِلتن = مفاعیلن ہوگا۔حاصل کلام یہ ہے کہ مفاعِلَتُن تسکین اوسط کے عمل سے مفاعیلن میں بدل جاتا ہے۔یعنی یہ عین ممکن ہے کہ کسی غزل،نظم، مثنوی وغیرہ کا ایک مصرع یا آدھا مصرع یا مصرع کا ایک رکن مفاعلتن ہو اور دوسرا مصرع مفاعیلن میں ہو۔واضح رہے کہ بحر ہزج کا سالم افاعیل مفاعیلن ہے تو کسی شعر میں اگر ایک مصرع مفاعلتن ہے اور دوسرا مصرع مفاعیلن ہے تو اس جگہ پر مفاعلتن کو بحر ہزج کا سالم افاعیل نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ بحر وافر کا مزاحف کہلائے گا۔پروفیسر عظیم الرحمٰن''کتاب العروض''کے صفحہ نمبر ۱۵۸ پر قمطراز ہیں کہ بحر وافر پر تسکین اوسط کا عمل''عصب''کہلاتا ہے۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ سات مروجہ سالم بحور میں بحر وافر مفاعَلَتُن اور بحر کامل مُتَفَاعلن پر تسکین اوسط کا استعمال کبھی بھی اور کہیں بھی ممکن ہے۔اب دوسری بحر، بحر کامل کے سالم افاعیل متفاعلن پر غور کریں تو دیکھتے ہیں کہ متفاعلن میں م،ت اور ف تینوں حروف لگاتار متحرک ہیں۔شعری ضرورت کے تحت ہر شاعر کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ متفاعلن کے متحرک ت کو ساکن کرکے حرف ماقبل سے ملا کر نیا وزن بنا سکتا ہے۔اس صورت میں یعنی متفاعلن پر تسکین اوسط کا عمل کرنے سے مُتْفَاعلن مُتُفَاعلن ہوجائے گا، لیکن یہ مانوس اور مستعمل افاعیل

نہیں ہے، اس لئے اسے اس کے ہم وزن افاعیل مستفعلن کا نام دیں گے۔ یہاں یہ بھی واضح کردوں کہ مستفعلن بحر رجز کا سالم افاعیل ہے، لیکن جب بحر کامل کے سالم افاعیل متفاعلن پر زحاف تسکین اوسط کے عمل سے جو مستفعلن حاصل ہوگا وہ بحر کامل کا مزاحف ہوگا جس کا نام بقول پروفیسر عظیم الرحمٰن ''عضب'' ہے۔ مثال کے طور پر شیخ سعدی کا مقبولِ عام قطعہ درج ذیل ہے۔

بلغ	العلٰی	بکمالہٖ
متفاعلن		متفاعلن
کشف	الدجیٰ	بجمالہٖ
متفاعلن		متفاعلن
حسنت	جمیع	خصالہٖ
متفاعلن		متفاعلن
صلوا	علیہ	والہٖ
مستفعلن		متفاعلن

درج بالا قطعہ کی باضابطہ تقطیع کر کے میں اپنا اور قارئین کا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا ہوں، اس لئے میں نے صرف ہر مصرعے کے نیچے اس کا وزن لکھ دیا ہے۔ آپ غور کریں چوتھے مصرعے کا پہلا رکن مستفعلن ہے۔ شیخ سعدی نے چوتھے مصرعے کے رکن اول کو زحافِ تسکین اوسط سے مستفعلن کر دیا ہے جو عروض کے اعتبار سے بالکل چست درست اور انتہائی خوش آہنگ بھی ہے۔

تسکین اوسط ایک عام زحاف ہے یعنی اس کا استعمال عروض وضرب صدر وابتدا اور حشوین کہیں بھی جائز ہے۔ یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ اس زحاف کا استعمال صرف سالم بحور تک محدود نہیں ہے، بلکہ زحاف بالائے زحاف بھی اس کا استعمال جائز ہے۔ مثال کے طور پر فَعِلن سالم افاعیل نہیں ہے، لیکن اس میں بھی ف، ل اور م لگا تار متحرک حروف ایک ساتھ جمع ہو گئے ہیں، اس لئے اسے زحاف تسکین اوسط کی مدد سے ''ع'' کو ساکن کر کے کہیں بھی فِعْلُن کر دیا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تسکین اوسط ایک عام زحاف ہے جس کے تحت کسی بھی سالم اور مزاحف افاعیل میں تین متحرک حروف ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو درمیانی حرف کو حرفِ ماقبل سے ملا کر نیا وزن بنانا عروضی اور فنی اعتبار سے بالکل جائز اور درست ہے۔ شاعروں کو تسکین اوسط سے فائدہ اٹھانا چاہئے تاکہ عمدہ مضامین نظم کرنے میں سہولت اور آسانی ہو۔

تسکین اوسط اور ''تخنیق'' میں بہت معمولی فرق ہے۔ تسکین اوسط کا استعمال کسی بھی افاعیل میں تین متوالی متحرک حروف کے ایک جگہ پر جمع ہونے پر درمیانی متحرک حرف کو ساکن کر کے حرفِ ماقبل سے ملا دیا جاتا ہے، جب کہ تخنیق کا استعمال اس مقام پر ہوگا جہاں دو ایسے افاعیل ایک جگہ پر آجائیں جس میں تین متوالی متحرک حروف موجود ہوں۔ ایسی صورت میں بھی درمیان کے متحرک حرف کو ساکن کر کے اس کے پہلے والے حرف سے ملایا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح تسکین اوسط میں ہوتا ہے۔ تخنیق کی مثال درج ذیل ہے۔

وزن ـــــــ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن

غور کیجئے کہ درج بالا مقبول عام وزن میں پہلے افاعیل مفعولُ کا ''ل'' متحرک ہے اور اس کے بعد کے افاعیل مفاعیلُ میں حرف ''م'' اور ''ف'' متحرک ہے گویا کہ یہاں ل، م اور ف تین حروف لگا تار متحرک ہیں، اس لئے یہاں بھی درمیان کے متحرک حرف ''م'' کو ساکن کر کے اس کے پہلے والے افاعیل مفعولُ کے آخری متحرک حرف ''ل'' سے ملا دیا جائے گا اور اس کے بعد جو نیا وزن وجود میں آئے گا وہ عروضی قاعدے کے مطابق ہوگا اور دونوں اوزان کو ایک ساتھ کسی بھی غزل، نظم اور مثنوی وغیرہ میں استعمال کیا جاسکتا ہے، یعنی کسی غزل، نظم اور مثنوی وغیرہ کا مصرع اولیٰ مفعولُ، مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن میں ہو اور مصرع ثانی تخنیق کے عمل کے بعد نئے وزن مفعولن مفعولن مفعولن فعلن میں ہو تو دونوں مصرعے موزوں ہوں گے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن سے تخنیق کے ذریعے مفعولن مفعولن مفعولن فعلن بنانے کے لئے تینوں مقامات پر تخنیق کا استعمال کیا گیا ہے جب کہ ہر شاعر کو یہ آزادی بھی نصیب ہے کہ وہ اپنی مرضی اور ضرورتِ شعری کے مطابق کسی ایک یا دو یا صرف ایک ہی رکن پر تخنیق کا استعمال کرے، جیسا کہ شیخ سعدی نے اپنے مقبول عام قطعہ میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، آخری مصرعے کے صرف

رکن اول پر زحاف تسکین اوسط کا استعمال کیا ہے اگر سعدؔی چاہتے تو دونوں متفاعلن کو مستفعلن میں تبدیل کرسکتے تھے۔

آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے اب تک دونوں زحاف کے اردو شاعری میں استعمال کئے جانے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے اردو کے بیشتر شعرا مولویانہ عروض کے پابند ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تسکین اوسط وتخنیق کا سب سے زیادہ فائدہ عربی شعرانے اٹھایا اور ان سے کچھ کم فائدہ فارسی شعرانے اٹھایا ہے اور اردو کے شعرا تو فارسی شعرا سے بھی کم فائدہ حاصل کرسکے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''عروض، آہنگ اور بیان'' میں ایک مستقل باب صفحہ ۲۶۳ سے صفحہ ۲۸۴ تک ''تسکین اوسط کے اسرار'' کے عنوان سے شامل ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

> ''یہ بات بہرحال درست ہے کہ فارسی میں تسکین اوسط
> کا رواج عربی کے مقابلے میں بہت کم ہے اور اردو میں
> اس کا رواج فارسی سے بھی کم ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس باب میں تخنیق کی جو مثالیں پیش کی ہیں، میں بھی اپنی آسانی کے لئے انہی مثالوں کو یہاں نقل کررہا ہوں ؎

لے لے کے بلائیں کاکلوں کی
مفعول مفاعلن فعولن
پیشانی چومی پیٹھ ٹھونکی
مفعولن فاعلن فعولن
(دیاشنکر نسیم)

حیرت آغاز و انتہا ہے
مفعولن فاعلن فعولن
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے
مفعول مفاعلن فعولن
(علامہ اقبالؔ)

درج بالا دونوں اشعار کا وزن ایک ہی ہے اس لئے کسی ایک کا تجزیہ پیش کرنا کافی ہوگا۔ دیاشنکر نسیم اور اقبالؔ دونوں کے اشعار کا اصل وزن مفعولُ مَفَاعلن فَعُولن ہے۔ اس وزن میں رکن اول کے مفعولُ کا ''ل'' اور اس کے بعد افاعیل مفاعلن کا م اور ف متحرک ہے اس لئے یہاں مفاعلن کے ''م'' کو ساکن کرکے مفعول کے ''ل'' سے ملا دیا گیا ہے۔ اس طرح تخنیق کے عمل سے مفعول مفعولن ہوگیا اور مفاعلن فاعلن ہوگیا اور فعولن اپنی اصل حالت پر قائم رہا، جس کے بعد نیا وزن مفعولن فاعلن فعولن بنا۔ واضح ہو کہ تخنیق کو تحنیق بھی کہا جاتا ہے اور اوزان رباعی میں اس کا استعمال بیش از بیش ہوتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے رباعی کے دو بنیادی اوزان پر زحافِ تخنیق ہی کے عمل سے بقیہ اوزان اخذ کئے گئے ہیں۔

لب لباب یہ ہے کہ تسکین اوسط اور تخنیق یا تحنیق ایک عام زحاف ہے۔ ان دونوں زحافات کا استعمال مصرعے کے عروض و ضرب، صدر وابتدا اور حشوین میں کہیں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اردو شعرا کو ضرورت شعری کے تحت ان دونوں زحافات کا استعمال بیش از بیش کرکے عمدہ خوش آہنگ کلام کہنا چاہئے اور اس آزادی سے بھرپور فائدہ حاصل کرنا چاہئے۔ ❁❁

مولانا ابوالکلام آزاد...... (ص ۲۸ سے آگے)

ڈیوٹی دونوں کے لیے لفظ 'فرض' ہی بولا جاتا ہے جو اگرچہ اصولاً غلط نہیں ہے، مگر توسیع زبان اور تدقیق علمی کے لحاظ سے صحیح نہیں، اسی لیے ایک عرصے سے ہم وظیفہ اور وظائف کو فرائض کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں تاکہ اپنے صحیح معنوں میں یہ الفاظ رائج ہوجائیں۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اردو کے بڑے بڑے مترجموں نے بھی آج تک اس فرق کو محسوس نہیں کیا اور ہر جگہ 'فرض' ہی کا لفظ لکھتے رہے۔ جب تک ملک میں عربی داں مترجم علوم جدیدہ پیدا نہ ہوں گے، اردو کی بد بختی لاعلاج رہے گی۔ اس حقیقت پر رویئے تو بہت سے مدعیان علم وتراجم کو شاق گزرتا ہے۔ یہ دوسری مصیبت ہے۔'' (بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد فکر وعمل کے چند زاویے: ڈاکٹر وہاب قیصر ص ۶۲) ❁❁

افسانے

سیّد احمد قادری

7, New Karimganj, Gaya - 823001 (Mob. 9934839110)

معدوم ہوتی روشنی

دیپاولی کے ختم ہونے کے بعد بھی شہر میں پھیلی آلودگی کو دیکھتے ہوئے کئی دنوں کے لئے اسکول بند کر دیا گیا تھا، اس لئے رویندر اوراس کی بہن سویتا کے کئی دوست اس کے گھر صبح دس بجتے بجتے آگئے اوررات کس طرح پٹاخے، گھرنیاں، انار، آسمان تارا چھوڑے، طرح طرح کی مٹھائیاں کھائیں، نئے نئے کھلونے آئے۔ یہ ساری باتیں سبھی ایک دوسرے سے شیئر کرنے لگے۔

کئی دوست دیوالی کے موقع پر ملنے والے اپنے کھلونے بھی ساتھ لیتے آئے، تاکہ سبھی مل کر کھیلیں۔شیام کے پاپا نے اسے ویڈیو گیم لاکر دیا تھا، ارشد کے ابو نے بھی ایک نئے طرح کا ویڈیو گیم لاکر دیا تھا۔ سبھی خوشی خوشی اب کھلونوں اور گیم سے کھیلنے لگے کہ اچانک شیام کا ویڈیو گیم چلتے چلتے رُک گیا۔ وہ آگے بڑھ نہیں رہا تھا۔ سارے بچوں نے اپنے اپنے طور پر کوششیں کیں، لیکن کامیابی نہیں ملی تو رویندر نے کہا، چلو داداجی کے پاس، وہ انجینئر رہ چکے ہیں، وہ ضرور اسے ٹھیک کر دیں گے۔ سبھی بچوں نے حامی بھری اور سبھی داداجی کے کمرے میں آگئے، لیکن یہ کیا، داداجی کا کھانستے کھانستے براحال تھا۔ انہیں اس طرح کھانستے ہوئے دیکھ کر سارے بچے پریشان ہوگئے:

''کیا ہوا داداجی، یہ آپ اتنا کھانس کیوں رہے ہیں؟''

داداجی نے ان پر ایک نظر ڈالی اور پاس میں ٹیبل پر رکھے گلاس سے پانی پیا اور کسی طرح اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے بولے:

''یہ رات کے ہر طرف چھوڑے جانے پٹاخوں سے بھری دیوالی کا اثر ہے بچو، میرے ساتھ ہر سال دیوالی کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمام رات کھانسی سے سو نہیں پاتا ہوں، لیکن کروں تو کیا۔''

بچوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور داداجی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''یہ دیوالی سے کھانسی کا کیا تعلق ہے داداجی؟''

داداجی مسکرائے اور کہنے لگے: ''تعلق ہے میرے بچو! وہ تعلق یہ ہے کہ کل رات جس طرح چٹائی بم، پٹاخے چھوڑے گئے، گھرنیاں اور انار چھوڑے گئے، ان سے نکلنے والے زہریلے دھوئیں نے پوری فضا کو پولیوٹ کر دیا۔'' داداجی نے یہ کہتے ہوئے بچوں سے سوال کر دیا:

''پولیوٹ کا مطلب تم لوگوں نے کیا سمجھا؟''

تمام بچوں نے ایک آواز میں کہا:

''پردوشن، یعنی پوری طرح پردوشت کر دیا۔''

یہ کہتے ہوئے ان بچوں کو یاد آیا کہ پٹاخوں اور انار وغیرہ کے جلنے کے بعد زبردست دھواں ہوتا تھا، یہاں تک کہ چاروں طرف پھیلی روشنی مدھم لگنے لگی تھی اوران کی آنکھوں میں بھی جلن ہونے لگتی تھی اور کئی بچوں کو تو کھانسی بھی ہوئی تھی۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے بچوں نے داداجی سے پوچھا:

''ہاں داداجی، پردوشن تو بہت پھیلتا ہے، لیکن ہم لوگ یہ آتش بازی نہیں کریں گے تو دیپاولی کا مزہ کیسے آئے گا؟''

بچوں کے اس سوال پر داداجی کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے:

''اچھا بچو! دیپاولی کا تم لوگ کیا مطلب جانتے ہو؟''

بچوں نے ایک دوسرے کا منھ دیکھا اور خاموش رہے۔

داداجی سمجھ گئے اور کہنے لگے:

''دیپاولی کا مطلب ہے، دیپ، روشنی اور آولی یعنی قطار در قطار روشنی، جو ہم لوگ دیوالی کے روز کیا کرتے تھے۔''

یہ سن کر بچوں کو کچھ تجسس ہوا اوران لوگوں نے پوچھا:

''داداجی آپ لوگ اپنے زمانے میں دیپاولی کیسے مناتے تھے۔ کیا فرق ہے آپ کے زمانے کی دیپاولی میں اور آج کی دیپاولی

میں، ذرا ہمیں بھی بتائیں۔''

جواب میں داداجی نے بڑھتی ہوئی اپنی کھانسی کے زور پر قابو پانے کے لئے پھر تھوڑا پانی پیا اور بتانے لگے کہ:

''آج کی دیپاولی میں ہر طرف شور ہے، ہنگامہ ہے، دھماکہ ہے اور سب سے بڑھ کر پولیوشن ہے، جس کی چنتا کسی کو نہیں۔ اسی پولیوشن کی وجہ کر ہمارے ملک میں ہر منٹ میں ایک آدمی کی جان چلی جاتی ہے اور تو اور دنیا میں جو پندرہ شہر سب سے پر دوشت مانے گئے ہیں، ان میں چودہ شہر ہمارے ملک کا ہی ہے، جن میں ہمارا یہ شہر بھی ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی آتش بازیاں ہوتی تھیں، لیکن اس قدر نہیں، جتنی زیادہ ان دنوں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ ہمارے زمانے میں ایسے طاقتور بموں کی طرح آواز کرنے والے اور دھوئیں سے بھرے پٹاخے نہیں ہوتے تھے، جن کے دھماکوں سے کان کے پردے پھٹ جائیں۔ چھوٹے چھوٹے پٹاخے اور، پھلجھڑیوں ہی سے ہم لوگ لطف اندوز ہوتے تھے۔ سچ تو یہ ہے میرے بچو کہ تمہاری ہی طرح ہمیں بھی بچپن میں دیوالی کے آنے کا بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ شام ہوتے ہی ہمارے گھر پر آس پڑوس کے ارمان چاچا، چاچی، ان کے سارے بچے جو میرے دوست تھے، فاروقی انکل بھی اپنی پتنی اور بچوں کو لے کر ہمارے گھر آجاتے تھے، دیناناتھ انکل بھی اپنے پورے پریوار کے ساتھ میرے یہاں آجاتے۔ ان سبھوں کے ہاتھوں میں ڈھیر سارے نئے نئے کپڑے، چینی کے بنے طرح طرح کے شیر، ہاتھی، بندر، گھوڑے کے کھلونے ہوتے تھے، مٹھائیاں، پھلجھڑیاں اور گھرنیاں ہوتی تھیں۔ یہ سارے لوگ آتے ہی ایک دوسرے سے گلے ملتے، دیوالی کی مبارکباد دیتے، لائے ہوئے تحفے تحائف ہم سبھوں میں تقسیم ہوتے۔ میرے پتاجی اور ماں جی بھی پہلے سے تیار رکھے تحفوں کو آئے ہوئے مہمانوں کے بیچ بانٹتے، پھر صاف ستھرے دھلے دھلائے گھر، آنگن، چھت اور دہلیز پر قطار در قطار گھی کے دیئے جلائے جاتے۔ میرا پورا گھر جیسے روشنی سے نہا جاتا، ایسا خوشنما منظر میرے گھر کے چاروں طرف ہوتا جو دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔ ہر جانب روشنی ہی روشنی۔ گھی کے جلتے دئے سے نکلتی خوشبو اور انوکھی رنگ برنگی روشنی سے ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں ہوتیں۔ دھن کی دیوی، لکشمی ماں کی آمد کا انتظار ہوتا اور گھر میں رکھی ان کی چھوٹی سی مورتی کی پوجا ہوتی اور ہم سبھوں کی زبان پر ویدک دعا ہوتی:

اساتوماست گمیا (جھوٹ سے ہمیں سچ کی طرف لے چل)

تم سوما جیوتر گمیا (اندھیرے سے روشنی کی طرف لے چل)

مرتیوما، مرتم گمیا (موت سے زندگی کی طرف لے چل)

اوم شانتی شانتی شانتی (ابدی امن ہو، امن، امن)

اور ان اشلوکوں کے جاپ سے ایسا لگتا کہ لکشمی دیوی ماں مسکراتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوگئی اور اس کے داخل ہوتے ہی محسوس ہوتا کہ ہر جانب خوشبو اور اُجالوں میں اضافہ ہوگیا۔ پوجا پاٹ کے بعد ہم لوگ کمروں سے باہر آتے، مٹھائیاں کھائی جاتیں، پھلجھڑیاں چھوڑی جاتیں، پھر ہم سبھی لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ کھانے میں ماں، چاچی، بوا کے بنائے ہوئے ایک سے ایک مزیدار پکوان ہوتے۔ ہم سبھی لوگ مزہ لے لے کر کھاتے۔ کتنے اچھے وہ دن تھے......''

یہ کہتے کہتے داداجی خاموش ہوگئے۔ ان کی آنکھوں میں یادوں کا سمندر تیرنے لگا۔

داداجی کو اس طرح اچانک اُداس ہوتے اور ان کی آنکھوں میں تیرتے آنسو دیکھ کر سارے بچے تعجب سے انھیں دیکھنے لگے۔ ان بچوں میں ان کا پوتا رویندر، داداجی کے قریب گیا اور دھیمے لہجے میں داداجی سے پوچھا:

''داداجی آپ رو کیوں رہے ہیں؟ کیا ہوا آپ کو......؟''

داداجی نے رویندر کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''نہیں، میرے بچے، میں رو نہیں رہا ہوں۔ بس کل اور آج کے فرق کو دیکھ کر میں غمگین ہوگیا ہوں۔ دراصل آج میں اپنے بچپن میں لوٹ گیا تھا۔ جہاں وہ سب کچھ تھا، جنھیں میں نے تمہیں بتایا، لیکن آج، یہ کیسا آج ہے؟ جب لوگوں کو اپنی شاندار روایت اور اپنے بچوں کی اچھی صحت کی پرواہ نہیں ہے۔ لوگوں کے گھروں سے گھی کے چراغ ختم ہوگئے۔ اب طرح طرح کے بجلی کے قمقمے جلتے ہیں۔ دیوالی کی مبارکباد بھی دینے لوگ ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے۔ واٹس اپ اور موبائل سے مبارکباد دئے جاتے ہیں، مٹھائیاں لوگوں نے کھانا بند کردیا کہ ان میں

ملاوٹ ہی ملاوٹ ہوتی ہے ۔اب مٹھائیوں کی جگہ ڈرائی فروٹس اور کینڈی نے ان کی جگہ لے لی ہے اور......اور...... ہر طرف یہ زوردار طاقتور پٹاخوں کے دھماکوں کا شور، چٹائی بموں کی چکاچوند...... ہر سمت بڑھتے شور اور فضا میں پھیلتے دھوئیں میں جیسے دیوالی کی رونق معدوم ہوتی جارہی ہے۔ ہر چہار جانب نوائز پولیوشن، ایئر پولیوشن......اب تو سانس لینا دشوار ہورہا ہے۔ پرشوتم رام کے بن باس سے لوٹنے پر چراغاں کی ہماری شاندار پرمپرا ہے۔ یہ پرمپرا ختم ہوکر اب تو اس نے دوسرا ہی روپ لے لیا ہے۔ ہم اس دن ویدک اشلوک پڑھتے ہوئے اوم شانتی، شانتی کی دعا مانگتے ہیں، لیکن شانتی، سکون چین کو ختم کرنے کے لئے کان کا پردہ تک پھاڑ دینے والے شور سے بھرے طاقتور پٹاخوں کے دھماکے کرتے ہیں۔ان دھماکوں سے سکھ شانتی کی پھیلی روشنی بھی مدھم ہوجاتی ہے، ایسے دھوئیں کے اندر جوزہریلی گیس ہوتی ہے، وہ ہماری سانسوں کے ذریعہ ہمارے جسم کے اندر پہنچ کر ہمیں بیمار بنائے ڈال رہی ہے۔ یہ شور، یہ ہنگامہ، یہ دھواں، یہ دھماکہ، یہ سب ہماری انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہمارے آس پاس اور گھروں میں رہنے والے حیوانات کے لئے بھی زبردست نقصان دہ ہیں۔ میں تو اب زندگی کے آخری زینے پر ہوں بچو، لیکن مجھے تمہارے بھوشیہ کی چنتا ہے اور یہی حال رہا تو......''

یہ کہتے کہتے داداجی خاموش ہوگئے اور ان کی آنکھوں سے ایک بار پھر اُداسیاں جھلکنے لگیں، جسے دیکھ کر سارے بچے، داداجی کے بالکل قریب آگئے اور کہنے لگے: ''آپ چنتا نہ کریں داداجی۔ ہم اور ہمارے سبھی دوست یہ پرتگیا (عہد) کرتے ہیں کہ اب ہم لوگ کبھی بھی پردوشن پھیلانے والے ایسے کسی پٹاخے اور بموں کا استعمال نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی کو کرنے دیں گے، سبھوں کو سمجھائیں گے۔ ہم اپنی لکشمی دیوی ماں اور سرسوتی دیوی ماں کو خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اب دیپاولی روشنی کا ہی تیوہار ہوگا اور ہر طرف پھیل رہے اندھیرے، جہالت اور برائیوں کا خاتمہ ہوگا......''

بچوں کی ان باتوں کو سن کر داداجی نے بے اختیار سبھوں کو اپنے سینے سے لگالیا اور خوش ہوکر اپنا بٹوہ کھول کر اس میں سے سبھی بچوں کو سوسو روپے کے نوٹ دیوالی کی پربی کے دینے لگے۔ ❀❀

غزلیاتِ اقبالؔ...... (ص ۷۱ سے آگے)

علامہ اقبالؔ کی شاعری میں ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں سلاست وسادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے عوامی اختیار کرتے ہوئے مشکل امور کو بڑے سہل انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کافر ہے تو شمشیر پر کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

غرض کہ اقبالؔ کی غزلوں کی خصوصیات ان کی ہمہ گیر شخصیت کی طرح ہمہ جہت ہے۔ انہوں نے مشکل انداز والفاظ کو بڑی نزاکت اور سہولیت کے ساتھ برتا ہے۔ اپنی غزلوں میں انسانیت کی ہمہ گیری، اعلیٰ تخیل کی پیش کشی کے علاوہ فن شاعری کے بنیادی ضابطوں سے بھی انہوں نے انحراف نہیں کیا ہے تاہم ان کی غزل گوئی کے پہلے دور میں روایت سے وابستگی دوسرے دور میں ماحولیاتی روایات سے انحراف اور تیسرے دور میں انقلابی رجحانات کو غالبؔ کے انداز میں پروان چڑھتا ہوا صاف صاف دیکھا جاسکتا اور اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چوتھے اور آخری دور میں اقبالؔ غزل کا انداز نظمیت سے وابستہ ہوگیا ہے جس سے اس فن پارے کو وسعت ملی ہے۔

اقبالؔ کی غزل گوئی میں موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے نئی جہت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے روایتی غزلیں تخلیق کیں اور اس سے انحراف بھی کیا۔ اقبالؔ نے اگرچہ غالبؔ کی طرح انقلابی غزلیں بھی لکھیں، لیکن غزل گو شاعر کی حیثیت سے انہوں نے غزل مسلسل کی روایت کو فروغ دے کر غزل کی شاعری نظم سے قریب بھی کیا۔ اس طرح ہم پاتے ہیں کہ اقبالؔ کی غزل گوئی انفرادیت سے وابستہ ہے، ساتھ ہی اس میں اس قدر لچک ہے کہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کو اختیار کرتی ہے اور اس طرح غزل سے الگ ہوتے ہوئے نظمیہ تفصیلات کی علمبردار ہوجاتی ہے۔ ❀❀

محمد طارق

"Inamdar House" P.o. Kholapur, Dist. Amravati - 444802
(Maharastra) (Mob. 8055503366)

ریت کی دیواریں

رشید علی رحمت اللہ کا پڑوسی تھا۔ پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی کرنے والا پڑوسی رحمت اللہ، رشید علی کے لئے اُس وقت سچ مچ اللہ کی رحمت لگنے لگا تھا جب اس کی بیوی بیمار ہوگئی تھی۔

وہ اچھی بھلی تھی۔ شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اُس کے پیٹ میں شدید درد اُٹھا، جی متلانے لگا۔ رشید علی نے سوچا تھا کہ حاملہ ہوگی۔ خوشی خوشی ڈاکٹر کو دکھایا، مگر جب ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور پیٹ کا ایکسرا وغیرہ نکالنے کے بعد تشویش ظاہر کی تو جیسے رشید علی کے پیروں تلے کی زمین کھسکنے لگی۔

''نہیں......ایسا کیسا ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر لٹیرے بن گئے ہیں، مہلک بیماریوں کا حوالہ دے کر پیسے لوٹتے رہتے ہیں۔ میری بیوی تو اچھی بھلی ہے!'' رشید علی اپنے پیروں تلے کھسکتی زمین کو قدموں سے جمانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ہمدرد رحمت اللہ کو سنانے لگا تھا:

''ڈاکٹر کہتا ہے میری بیوی کو جگر کا سرطان ہے!''

''خدا نہ کرے......! بڑی مہلک بیماری ہے، خدا دشمن کو بھی نہ دے، اللہ سے دعا کرو بھائی! میں بھی دعا کروں گا کہ ڈاکٹر کی تشخیص غلط نکلے۔ دوا کے ساتھ دعا بھی ضروری ہے۔ اس نے بیماری دی ہے، وہی شفا بھی دے گا۔ آیت کریمہ کا وظیفہ کیا کرو، انشاء اللہ تمہاری بیوی یقیناً صحت یاب ہوجائے گی۔''

رحمت اللہ رشید علی کو تسلی دے کر رخصت ہوگیا تھا اور اپنے دل کے گوشے میں جہاں اس نے اپنی ان گنت امیدوں کا گلا دبوچا تھا، وہیں ایک امید سانس لینے لگی تھی اور اس کا چہرہ خوشی سے اس طرح چمکنے لگا تھا جیسے مطلع صاف ہونے پر سورج چمکتا ہے۔

رشید علی کی بیوی کی بیماری کی خبر سن کر رشید علی کو تسلی دینے سے پہلے رحمت اللہ کو اپنی بیٹیوں کا خیال آیا تھا۔ رحمت اللہ دو بیٹیوں کا باپ تھا۔ بڑی بیٹی کا نام فوزیہ تھا اور چھوٹی جمیلہ۔ دونوں درخت کی شاخ پر لٹکے اس پکے ہوئے پھل کا تصور پیش کرتی تھیں جو جھولی میں گرنے کے لئے بیتاب ہو، مگر ان کے لئے کوئی جھولی پھیلائے نہیں آیا تھا، جو بھی آیا تھا جہیز کے لئے کشکول لے کر ہی آیا تھا۔

رحمت اللہ کورٹ کا چپراسی۔ ان کے کشکول بھرنے کے لائق نہیں بن سکا۔ کورٹ میں جو کچھ ''بالائی آمدنی'' ہوتی۔ روز بہ روز بڑھتی مہنگائی کی نذر ہو جاتی اور رحمت اللہ اپنی بیوی اور دونوں لڑکیوں کے پیٹ کی آگ کفایت شعاری سے ہی بجھا پاتا۔ وہ بیٹیوں کے تن کی آگ بجھانے کی آتش فکر میں تن تنہا جلتا رہتا۔ آج ''فکر آتش'' اس کے لئے جیسے گلزار بن گئی تھی۔ اس کا دل یہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ اس کی بڑی بیٹی فوزیہ نے رشید علی کی بیوی صفیہ کی دورانِ علالت سے ہی اچھی پڑوسن کے فرائض کی انجام دہی شروع کردی ہے۔

فوزیہ صفیہ کی اچھی پڑوسن ہی نہیں اس کی سہیلی بھی تھی۔ کلاس فیلو اور صفیہ کی رازدار بھی۔ فوزیہ کے دل میں صفیہ کا وہ راز بھی دفن تھا جو صفیہ نے اس کے سوا کسی اور کو نہیں بتایا تھا۔ وہ راز یہ تھا کہ رشید علی اور وہ شادی سے قبل ہی ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ عشق کے عہد و پیماں کے خطوط لکھا کرتے تھے۔ وہ سارے خطوط اس نے بڑے سلیقے سے ایک فائل میں سینت رکھے تھے، جس میں ایک ساتھ جینے اور مرنے کی بارہا قسمیں کھائی گئیں تھیں۔ ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے زندگی گزارنے کے وعدے کئے گئے تھے۔

فوزیہ نے وہ خطوط بار بار پڑھے تھے۔ خطوط کی تحریر میں ایسے جذبات کی عکاسی کی گئی تھی کہ جب بھی وہ خطوط پڑھتی اُس کے

دل میں لذت آمیز گدگدیاں ہونے لگتی تھیں۔صفیہ نے فوزیہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ رشید علی سے پہلے ایک حمال کا لڑکا فضلو بھی اسے بے انتہا چاہتا تھا۔ وہ کسرتی بدن کا مالک تھا، اونچا پورا، ہر دم اُسے تکا کرتا تھا۔

ایک بار فضلو نے بذریعہ تحریر صفیہ سے اظہار محبت بھی کیا تھا، لیکن اُس نے فضلو سے عشق کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور بھائی کے ہاتھوں اس کی خوب مرمت کروائی تھی۔اس کے علاوہ صفیہ نے اُسے سہاگ رات کی باتیں بھی چٹخارے لے لے کر سنائی تھیں، جسے سن کر فوزیہ کے منہ میں وہ پھیکا پھیکا پانی آ گیا تھا جو بدن کی پیاس بجھاتا نہیں بھڑکاتا ہے۔

جب فوزیہ کی نظریں رشید علی پر پڑتیں اُسے صفیہ کی سنائی ہوئی وہ ساری باتیں، عشقیہ خطوط کے وہ جذباتی جملے یاد آ جایا کرتے اور وہ اپنے نچلے لب کا کونہ دانتوں میں دبا کر اندر ہی اندر کسمساجاتی۔ اس کا اَنگ اَنگ انگڑائیاں لینے لگتا۔

فوزیہ کو صفیہ کی تیمارداری میں دن بدن لطف آنے لگا تھا۔ تیمارداری میں صفیہ کے لئے دودھ گرم کرنا، موسمی کا رس کشید کر کے اُسے پلانا اور رشید علی کے لئے کھانا بنانا بھی شامل تھا۔

رشید علی کے کھانے کی فکر صفیہ کو بھی ہمیشہ رہتی تھی۔شدید بخار کی حالت میں بھی وہ فوزیہ کو ہدایتیں دیا کرتی تھیں:

''فوزیہ! ان کے لئے کھانا اچھا بنایا کرو۔تیل زیادہ ڈالا کرو، مرچ کم کھاتے ہیں، گرم مسالا انہیں پسند ہے، سلاد میں ٹماٹر، پودینے کے پتے، شلجم، پیاز اور لہسن کی دو تین کونپل یاد سے رکھ دیا کرو۔''

''فوزیہ کھانا بہت اچھا بنا رہی ہے۔جیسا تم بناتی تھی بالکل ویسا ہی، تم فکر نہ کرو!'' رشید علی فوزیہ کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور فوزیہ رشید علی کی مسکراہٹ چسکیاں لے کر پی لیتی۔

صفیہ بستر پر آنکھیں موندے اللہ سے دعا کرتی:

''اے میرے رب! مجھے اپنے شوہر کی خدمت کے لئے تندرست کر دے، یا اللہ وہ میرے بغیر جی نہیں پائیں گے!''

دعا کے بعد اُسے ایسا لگتا جیسے اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی ہو، پھر وہ آنکھیں ایسے کھولتی جیسے اس کی پلکوں پر منوں بوجھ ہو۔

''میں اچھی ہو جاؤں گی نا؟'' اس کے سوکھے لب کپکپاتے:

''ہاں......!''

''ہاں......!'' دونوں سٹپٹا کر کہتے اور پھر اس پر جھک جاتے۔

''تم یقیناً اچھی ہو جاؤ گی صفیہ! ڈاکٹر نے کہا ہے فکر کی کوئی بات نہیں، بس تم آنکھیں بند کئے پڑی رہو!'' رشید علی صفیہ کو کہتا اور وہ آنکھیں بند کر لیتی۔رشید علی اپنی بیوی کی بند آنکھیں دیکھ کر فوزیہ کو آنکھ دبا کر اشارہ کر دیتا اور پھر دونوں کے لبوں پر شاطرانہ مسکراہٹ رینگ جاتی۔ایک دن اُن کی شاطرانہ مسکراہٹ رنگ لائی۔صفیہ چل بسی۔

روئے سب، رشید علی بھی رویا۔فوزیہ کی پلکوں سے بھی آنسو ٹپکے اور رحمت نے بھی آنکھیں میچ میچ کر پڑوسی کا حق ادا کرنے کے لئے آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکالے، البتہ بے اختیار جو روئے تھے وہ صفیہ کے والدین تھے۔

صفیہ کی لاش کو نہلایا گیا، کفنایا گیا......

جنازہ جا رہا تھا۔چار کندھوں پر سوار......

ایک کندھا صفیہ کے باپ کا تھا جس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں اور اس کے ذہنی افق پر صفیہ کی شادی کا منظر تھا جس میں اُس نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔شادی کے قرض کا بوجھ بیٹی کے جنازے کے بوجھ سے زیادہ لگ رہا تھا۔کاش! صفیہ شادی سے پہلے مر جاتی تو...... اس خیال کے ساتھ ہی اُسے اپنی بیٹی کا جنازہ ایسا لگنے لگا تھا جیسے وہ اپنے کندھوں پر پہاڑ لے کر چل رہا ہو۔

ایک کندھا رحمت اللہ کا تھا جس کے ذہن میں رشید علی کو داماد بنانے کا خیال کروٹیں لے رہا تھا۔ایک کندھا رشید علی کا تھا جس کے تصور میں فوزیہ کی ادھ کھلی شہوت بھری آنکھیں تھی اور وہ اس میں غوطے لگا رہا تھا اور ایک کندھا حمال کے لڑکے فضلو کا تھا جو ابھی تک کنوارا تھا۔نحیف، دبلا پتلا، اس کا چہرہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد تھا۔اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی دنیا ہی اجڑ گئی۔فضلو کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، لیکن اس کا دل رو رہا تھا اُس کی روح ہچکیاں لے رہی تھی۔

صفیہ کا جنازہ جا رہا تھا...... چار کندھوں پر سوار

فوزیہ اپنی سہیلی کا جنازہ دیکھ رہی تھی اور خوابوں میں رشید علی کی بانہیں سرخ جوڑے میں ملبوس اس کے بدن کو دبوچے جا رہی تھیں۔ ❁❁

اسلم سلازار
C/o Md. Aslam Jehangir, New Millat Colony, Sector -1, Opp. Sabazpura More,
P.o Khagaul, Patna- 801105 (Mob.9830583747)

مین ہول

بات خود اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

بس یونہی......بیٹھے بیٹھے......بیتے دنوں نے جیسے پیچھے سے دامن پکڑ کر اسے کھینچ لیا اور وہ یادوں کی تپتی سڑک پر چل پڑا۔

بارش کے جمے ہوئے پانی نے سڑک پر چھوٹے بڑے گڈھے بنا دئے تھے، جن پر اس کی ٹرک ہچکولے کھاتی بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے من میں سرور تھا اور آنکھوں میں نشہ ابھی ابھی یاروں کے ساتھ لی گئی شراب کا، اپنی سلجھی ہوئی بیوی کے سڈول حسن کا اور اپنے اسکول جاتے اکلوتے منے کا۔

منا......اس نے سوچا، اسے تو وہ اس ڈرائیوری کے دھندے سے الگ ہی رکھے گا۔ وہ پڑھے لکھے گا۔ بڑا آدمی بنے گا۔ کم از کم پانچ دس ٹرکوں کا مالک تو ضرور۔

تبھی اچانک جیسے اس کا منا باہیں پھیلائے بیچ سڑک پر آ گیا اور اس نے بڑی تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا تھا۔

تپتی سڑک پر چلتے چلتے اس کے تلووں میں چھالے پڑ گئے تھے اور ان میں سے شاید کوئی چھالا پھوٹ گیا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے اور لبوں پر پیاس کی سوئیاں چبھنے لگیں۔ من میں ایک عجیب سی تڑپ تھی۔

بات خود اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ جس شئے نے اس کی رفتار چھین لی، اسے بیساکھی تھما دی اور جسے خود اس نے بھلانے کے لاکھ جتن کئے، اس شئے کی طلب آج اسے اس قدر کیوں بیتاب کئے دیتی ہے۔

ٹرک حادثے کے بعد یونین والوں نے کسی طرح مالک سے معاوضہ دلوا دیا، مگر وہ اسی قدر تھا کہ دوا علاج کے بعد چند ہفتوں میں ہی روٹیاں تعداد میں گھٹنے لگیں اور اس روز اس کے دل پر ہزار بچھوؤں نے جیسے ایک ساتھ ڈنک مارا تھا جب اس کی بیوی نے کسی گھر میں نوکری کے لئے پہلی بار قدم نکالا تھا اور اس روز تو وہ کٹ کر ہی رہ گیا جب اس نے اپنے اکلوتے منے کو...... بڑا آدمی اور پانچ دس ٹرکوں کا مالک بننے والے منے کو......ایک موٹر مکینک بنانے کے لئے گیرج لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس نے سوچا، کاش اس حادثے نے اس کی جان ہی لے لی ہوتی، مگر اس کے سپنے اس سے نہ چھینے ہوتے۔

تیز، تپتی سڑک، شاید اس کے تلووں کے کچھ اور چھالے پھوٹ گئے تھے۔ حلق کی چبھن، ہونٹوں کی پیاس کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ من جیسے اندر سے سوکھ کر ٹوٹا جا رہا تھا۔

اس کی بیوی اپنے کام پر گئی تھی اور اس کے اپنے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ اس نے سوچا شاید اس کی بیوی کے پاس کچھ پیسے ہوں، مگر اس کے پاس بھی کہاں سے آئے یا ممکن ہے، سیٹھانی نے حسب معمول کسی طرح کے پیسے دئے ہوں۔ اس نے ہر زاوئے سے سوچا، مگر کمبخت آتی کیوں نہیں، اس کی بیقراری بڑھتی چلی جا رہی تھی اور پیاسا پنچھی پھڑک پھڑک کر ڈال بدل رہا تھا۔ تبھی اس کی بیوی آ گئی۔

''کچھ پیسے ہیں تیرے پاس؟'' اس کے لہجے میں کچھ تپش تھی۔

''کیسے پیسے؟'' سلجھی ہوئی اور اب بے رونق حسن والی بیوی نے معاملے کو تاڑنے کی کوشش کی۔

''بس مجھے چاہئیں ......'' اس کے انداز نے بیوی کو فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچا دیا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔

''تو جھوٹ بولتی ہے......''

''میں کیوں جھوٹ بولوں......اپنے منے کی قسم!''

منے کی قسم نے اسے پیچھے ڈھکیل دیا۔ وہ دھب سے پلنگ پر دوبارہ جا بیٹھا،مگر اس کے من میں جگی ہوئی یہ نامراد پیاس۔

وہ سوچتا رہا...... کیا کرے ...... کیا کرے......تبھی اسے اپنے پرانے یاروں کا خیال آیا شاید کوئی موجود ہو اور کچھ چل جائے یہ سوچ کر اسے یگ گونہ سکون محسوس ہوا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بغل میں بیساکھی دبائی اور کھٹ کھٹ چل پڑا۔

گرم، تیز لو والی، جلتی ہوئی دوپہر تھی، سڑک ویران......! وہ خود تھا اور تپتی ہوئی سڑک پر کھٹ کھٹ کرتی اس کی بیساکھی۔ اچانک وہ رک گیا۔ سامنے ایک مین ہول کھلا ہوا تھا اور وہیں پر اس کا ڈھکن پڑا تھا۔

ایک لمحہ کو اس کے من میں کوئی چور جاگا اس نے دھیرے سے جھک کر ڈھکن اٹھایا اور اپنے سر پر لپٹے گمچھے میں لپیٹ کر چل دیا، پھر جانے وہ اپنے یاروں کے پاس گیا یا نہیں، مگر جب لوٹا تو آسودہ مست اور نشے میں دھت۔ گھر آتے ہی سیدھے پلنگ پر آ گرا۔

تیز تیز تپتا سورج کہیں دور تاریکی کی چادر تانے سو چکا تھا۔ رات کب کی پوری کی پوری اتر آئی تھی اور وہ اب بھی اپنی ڈیڑھ ٹانگیں پسارے سویا پڑا تھا۔ اس کی بیوی روٹیاں سینک رہی تھی اور اس کے من کے توے پر جیسے بوند بوند تشویش ٹپک کر چھن چھن کر رہی تھی۔ اس کا منا ابھی تک اپنے کام پر سے واپس نہیں لوٹا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔ ان دنوں شہر بھی کچھ اشانت تھا اور آج اس نے اپنے منے کی جھوٹی قسم بھی کھائی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ایک نظر اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ابھی تک یہ لنگڑا بے سودھ پڑا ہے۔

اس نے اٹھ کر اسے جھنجھوڑا:

''ارے اب اٹھو گے بھی......منا اب تک نہیں لوٹا۔''

''آ جائے گا......''اس نے بیوی کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

''ہوش میں آؤ، اندھیرا ہوئے بہت دیر ہوگئی۔ رات ہوگئی ہے۔''

''رات ہو چکی ہے اور منا ابھی تک نہیں آیا۔'' وہ ایک دم اپنے آپ میں لوٹ آیا۔

''سنو، جا کر دیکھ آؤ نا...... بات کیا ہے۔''

''ہاں......'' ایک بار پھر اس نے بغل میں بیساکھی دبائی اور چل پڑا۔ راستہ وہی تھا، سڑک وہی تھی، مگر تاریک، نیم تاریک...... کہاں گیا۔ منا اب تک لوٹا کیوں نہیں۔ سامنے اسے کچھ بھیڑ سی دکھائی دی......وہیں......اسی مین ہول کے پاس......

''کیا ہوا......؟''

''شاید کوئی اندر گر گیا۔''

اس کا دل دھک سے رہ گیا......منا؟ ورنہ اب تک لوٹا کیوں نہیں۔ گیراج تو کب کا بند ہو گیا ہوگا۔

''ہاں، کوئی ڈوب گیا۔''

''برسات کے پانی کا بہاؤ ہے......نہ جانے وہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہوگا۔''

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بیساکھی بغل میں کانپنے لگی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا......ٹوٹا...... بے جان۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے جیسے اسے صدیاں لگ گئیں۔ پاؤں منوں کا ہو گیا اور بیساکھی زمین میں دھنس گئی۔ بیوی سے کیا کہے گا...... جو کنواں اس نے کھودا اس میں خود اسی......

بڑی مشکل سے اس نے بیساکھی اٹھائی اور گھر میں داخل ہوا۔ سامنے اس کا منا بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ باپ کو آتے دیکھ ٹھٹھک گیا۔ اس کی ماں جھٹ سے بولی:

''اس کا دوست اسے سنیما دکھانے......''

اس نے جانے کچھ سنا بھی یا نہیں، بس ایک طویل سانس اس کے سینے سے آزاد ہوا اور اس کے من کا سارا بوجھ......سارا غم اس سانس کے ساتھ فضا میں تحلیل ہو گیا۔

''ارے کچھ نا بول......ہم بچ گئے......بس سمجھ کہ آج ہم برباد ہونے سے بچ گئے۔ کیسے تو وہ کوئی اور تھا......''

اس کی بیوی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اس کا خوشی سے تمتماتا چہرا دیکھتی رہی۔ باپ نے جھک کر بیٹے کا سر بڑے پیار سے سہلایا پھر اسے کھڑا کر کے اپنے سینے سے چمٹا لیا......اور جیسے اچانک......اس کے من کے مین ہول کا ڈھکن ہٹ گیا اور منا اس کے اندر بہتے غلیظ اور بدبودار پانیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ❁❁

طنز و مزاح

جہانگیر انس
Ranipur, Barharia, Siwan-841232 (Mob.9162357830)

بڑھاپا نامہ

میرے دادا حضور فرمایا کرتے تھے کہ بڑھاپا ایک ایسا عطیۂ خداوندی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے برسوں ریاضت کرنی پڑتی ہے۔قوتِ سماعت،قوت بصارت اور دانتوں کی قسط وار قربانی دینی پڑتی ہے،جسم کو تھکانا اور جھکانا پڑتا ہے،جس کی وجہ سے داڑھی اور سر کے بالوں میں چاندی اُتر آتی ہے۔ بڑھاپا ایک ایسا ثمر آور درخت ہے جس کی جڑ بچپن کی معصومیت اور شوخی سے اور اس کی شاخیں وٹہنیاں جوانی کی سرمستی اور جدوجہد سے پرورش پاتی ہیں۔

ایک دانا شخص سے کسی نے بڑھاپے کی نشانیاں دریافت کیں،اُس دانا شخص نے جواب دیا:

''دنیا داری سے زیادہ دینداری میں دلچسپی بڑھ جانا، آخرت کی زندگی کا یاد آنا، بات بات میں بزرگان دین کے اقوال پیش کرنا، مسجد میں امام کے پیچھے پہلی صف میں کھڑے ہونے کی کوشش کرنا اور بیمار ہونے پر ایلو پیتھک دواؤں کے بجائے ہومیو پیتھک، یونانی اور آرویدک دواؤں کی ضد کرنا۔''

اس کے برعکس علامہ گرگٹ کا کچھ اور ہی خیال ہے۔ ان کے خیال کے مطابق:

''جب انسان قوتِ سماعت اور قوتِ بصارت کے ضائع ہونے کا شکوہ کرنے لگے،نوجوانوں کی رنگین باتیں چھپ چھپ کر سننے کی کوشش کرے،خواتین کو گھور کر دیکھے اور احتجاج کرنے پر شرمندہ ہونے کے بجائے یہ جواز پیش کرے کہ بیٹی یا بہن میں تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم کہیں ارشد کی بیٹی یا محمود کی بہن تو نہیں ہو۔ اپنی ہر جائز یا ناجائز خواہش کو منوانے کے لیے بھوک ہڑتال کرنے کی دھمکی دینے لگے تو سمجھ لیجیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔''

ماہرین نفسیات کے نزدیک:''بڑھاپا ایک تصوراتی مرض ہے، ایک نفسیاتی مرض ہے، سوچ اور فکر کا نتیجہ ہے۔''

ایک شخص کا کہنا ہے کہ''جب کوئی انسان دانائی کی باتیں کرنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔'' لیکن بڑھاپے کی یہ تعریف کسی کے لئے بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ:''جب انسان دادا، نانا بن جائے، محلّہ کی عورتیں انکل کہنے لگیں اور پردہ کرنا چھوڑ دیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔''

دیہات میں رہنے والوں کے نزدیک ''سٹھیا جانا'' بڑھاپے کی علامت ہے۔ قاموس میں آپ کو سٹھیانے یا سٹھیا جانے کا معنی نہیں ملے گا، گوگل مہاراج بھی اس کا معنی بتانے سے ہاتھ کھڑا کر لیں گے۔ لفظ ''سٹھیا جانے'' کا تعلق شاید عمر سے ہے اور ساٹھ سے نکلا ہے۔ یعنی انسان کی عمر جب ساٹھ سال کی ہو جاتی ہے تو وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ سٹھیا جانے کا مفہوم بہکی بہکی باتیں کرنا بھی ہوسکتا ہے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک ''جب انسان کی جسمانی طاقت، اولاد اور یادداشت جواب دینے لگے اور بیوی کی قربت کی چاہت بڑھ جائے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔'' غرض کہ کسی کے نزدیک بڑھاپے کی نشانیاں کچھ ہیں تو کسی کے نزدیک کچھ اور۔

تمام تعریفیں اپنی جگہ، حقیقت یہ ہے کہ فطری بنیادوں پر روبہ عمل ہونے والی تمام تبدیلیاں خالق دو جہاں کی مرہون منت ہیں۔ صبح، دن اور رات کی طرح بچپن، جوانی اور بڑھاپا بھی ایک فطری عمل ہے اور ان دونوں فطری عمل میں کافی مماثلت بھی ہے۔

مشرقی ماحول میں لڑکیوں کے بچپن کا دور بارہ سال تک اور لڑکوں کا چودہ سال تک تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ماحول اور علاقائی آب وہوا کے طفیل کچھ بچے بچیاں طے شدہ عمر سے پہلے ہی بالغ

اور جوان ہو جاتے تھے۔ آج کے دور میں لڑکیوں کا بچپن اٹھارہ سال تک قائم رہتا ہے تو لڑکوں کا بیس سال کی عمر تک، یعنی لڑکیاں اٹھارہ سال کی عمر میں بالغ اور جوان ہوتی ہیں تو لڑکے بیس سال کی عمر کے بعد یہاں بھی لیڈیز فرسٹ کا اصول قائم ہے ۔ خواتین ہر معاملے میں مردوں سے دو قدم آگے رہتی ہیں۔

معاشرہ سماج اور حکومت نے بچپن کی عمر جو بھی مقرر کی ہو، لیکن موجودہ صورت حال کچھ اور ہی حقیقت بیان کرتی ہے۔ آج بچپن کا دور شاعروں کے صنم کی تصوراتی کمر بن کر رہ گیا ہے　ع

سنا ہے صنم کو کمر ہی نہیں ہے

بچے آج بھی ماں کے پیٹ سے بچے ہی کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن انٹر نیٹی فضا کے سبب ان کے تمام احساسات، جذبات اور خیالات عہد شباب کے ہوتے ہیں۔ انگریزی اسکول میں پڑھنے والے ایک چھ سال کے لڑکے نے اپنے والد سے سوال کیا:

''ابا! میں کہاں سے آیا ہوں؟''

والد نے جواب دیا:

''پریوں کے دیس سے۔''

لڑکے نے دوسرا سوال کیا:

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

والد نے جواب دیا:

''میں بھی پریوں کے دیس سے آیا ہوں''

لڑکے نے تیسرا سوال کیا:

''دادا اور پردادا کہاں سے آئے تھے؟''

والد جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا:

''وہ بھی پریوں کے دیس سے آئے تھے۔''

والد کا جواب سن کر لڑکا سر کھجلانے لگا۔ والد نے پوچھا:

''کیوں، کیا سوچ رہے ہو؟''

لڑکے نے کہا: ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمارے خاندان میں کسی بھی مرد کے اندر بچے پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اس لیے خاندان چلانے اور بڑھانے کے لئے بچوں کو پریوں کے دیس سے لانا پڑتا ہے۔''

بچپن کے بعد بہاروں کے دن اور ارمانوں کی راتیں یعنی جوانی کا دور آتا ہے۔ اس دور کے تعلق سے شاعروں اور ادیبوں نے لاکھوں صفحات سیاہ کر دیے ہیں۔ اس دور میں انسان کے اندر رنگینیاں ہوتی ہیں، امنگ وحوصلہ ہوتا ہے، جوش وولولہ ہوتا ہے، جدوجہد ہوتی ہے، بے خطر آتش عشق میں کود پڑنے کا جذبہ ہوتا ہے، جوانی کی کشش ایسی ہوتی ہے کہ بچے اپنی حرکات وسکنات سے خود کو جوان بننے کی کوشش میں دن رات سرگرداں رہتے ہیں تو بوڑھے اپنی جوانی کو قائم رکھنے کے لئے الکٹرانک ڈیوائس سے چہرے کی جھریوں کو مٹانے میں سرگرداں۔ مصنوعی ایجادات مثلاً مختلف لوشنوں اور فیئر اینڈ لولی سے چہرے اور بالوں کو چمکاتے ہیں، طاقت کے حصول کے لیے معجون اور شباب آور دواؤں کا استعمال کرتے ہیں، منھ کے پوپلا پن کو دور کرنے کے لیے مصنوعی دانت لگواتے ہیں، جسم کو فٹ رکھنے کے لیے کمرے کے اندر بہوؤں کی نظریں بچا کر کسرت اور یوگا کرتے ہیں، لیکن قدرت کے اصول کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا　ع

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے

لاکھ جتن کے باوجود بڑھاپا اپنا جلوہ دکھا ہی دیتا ہے۔ بچپن رخصت ہو جاتا ہے، جوانی آتی ہے اور رخصت ہو جاتی ہے، لیکن بڑھاپا تنہا نہیں جاتا انسان کو اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔

مغرب کے مادر پدر آزاد معاشرے میں بچپن، جوانی اور بڑھاپا کوئی معنی نہیں رکھتا، زندگی کا مطلب ان کے نزدیک انجوائے کرنا ہے۔ سبھی اپنے مالک ومختار ہوتے ہیں، لیکن مشرق میں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے اپنے اپنے حدود ہیں اور بچوں اور بوڑھوں کی جوانوں جیسی حرکتیں معیوب سمجھی جاتی ہیں، لیکن انسان کا دل نہایت چنچل ہوتا ہے اسے عمر کے پنجڑے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

مشرق میں اپنے جرم کی طرح اپنا بڑھاپا کو بھی تسلیم کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ جرم تو تھانے کی ''تھرڈ ڈگری'' سے لوگ قبول بھی کر لیتے ہیں، لیکن بڑھاپا تسلیم کرانے کا کوئی مرکز نہیں، اس لئے بڑھاپا تسلیم کرانا ناممکن ہے۔ خواتین تو اس معاملے میں بالکل ''مارشل لاء'' ہوتی ہیں۔ ان کی عمر کی گاڑی دو یا تین سال کا سفر ایک سال میں

طے کرتی ہے۔ میرے پڑوس میں تین بچوں کی ماں مسز عاصمہ کریم اللہ رہتی ہیں۔ تین سال سے مجھے ان کی اکیسویں سالگرہ کی تقریب میں ماحضر تناول فرمانے کا شرف حاصل ہو رہا ہے اور بدلے میں اپنی جیب بھی خالی کرنی پڑتی ہے۔ اگر کسی خاتون کو کسی کی باتوں سے یہ احساس ہو جائے کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہے تو وہ اسی دن خودکشی کرلے گی اور مذکورہ شخص کو غیر ارادتاً قتل کیس میں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

بڑھاپا ایک حقیقت ہے، لیکن دور حال میں کوئی بھی بوڑھا اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آئے تو کسی بوڑھے کو ''بوڑھے میاں'' کہہ کر دیکھ لیجئے۔ آپ کے سامنے اس طرح لٹھ لے کر کھڑا ہو جائے گا کہ آپ کی جوانی کی تمام ہیکڑی بھاپ بن کر ناک کے راستے نکل جائے گی۔ ایک دفعہ دوران سفر ٹرین میں تقریباً اسّی سال کے بوڑھے کو، ''بوڑھے بابا'' کہنے کی حماقت مجھ سے سرزد ہوگئی۔ انہوں نے اس طرح مجھے قہر آلود آنکھوں سے گھورا جیسے میں نے ان کی عزت پر ڈاکہ ڈال دیا ہے۔ ان کی آنکھوں کی تپش نے مجھے ان کی آنکھیں بچا کر ایک کونے میں دبک کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ آج بھی ان کی قہر آلود نظریں یاد آتی ہیں تو میرے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

آج کے بچے بوڑھوں کی نصیحتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک دن نصیر میاں کے دس سالہ نٹ کھٹ پوتے نے ان کی نصیحت آمیز باتیں سن کر ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

''بیٹا بوڑھوں کی نصیحتوں کو جنگلی طوطوں کی ٹیں ٹیں یا کوؤں کی کاؤں کاؤں سمجھ کر نظر انداز کر دینا یا ان کا مذاق اڑانا اچھی بات نہیں۔ بوڑھے بھلے ہی نصابی اور انٹرنیٹی تعلیم میں آج کے بچوں اور جوانوں سے کم ہیں، لیکن انہوں نے دنیا کے بہت سے سرد و گرم موسم جھیلے ہیں۔ تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی تکالیف اور مصیبتوں کا سامنا کیا ہے، لیکن اپنے وجود کو مٹنے نہیں دیا ہے۔ ان کے بالوں کی سفیدی دھوپ کی مرہون منت نہیں بلکہ ان کے گزارے ہوئے مہ و سال کا تحفہ ہے۔ ان کے کشکول میں کامیابی اور ناکامیوں کی بیشمار پڑیائیں درس عبرت کے لیے موجود ہیں۔ ان کی نحیف آواز کے زیر و بم میں کامیابی حاصل کرنے کے نسخے پوشیدہ ہوتے ہیں۔''

اپنے دادا کی بات سن کر نٹ کھٹ پوتے نے کہا:

''کیا اب لوگوں نے بوڑھا ہونا بند کر دیا ہے۔

نصیر میاں نے تعجب سے اپنے پوتے کی طرف دیکھا اور کہا:

''یہ کیسا سوال ہے؟''

پوتے نے جواب دیا: ''مجھے تو کہیں بھی سفید بال اور چہرے پر جھریوں والے بوڑھے نظر نہیں آتے۔''

نصیر میاں کی عمر ستر سال سے اوپر تھی۔ ان کے تمام دانت ٹوٹ چکے تھے، لیکن انہوں نے مصنوعی دانت سیٹ کرا لیا تھا۔ بالوں کو ہمیشہ سیاہ کیے رہتے۔ چہرے کی چمک دمک قائم رکھنے کے لیے مختلف لوشنوں کا استعمال کرتے۔ مختلف قسم کی قوت بخش غذائیں اور ادویات کھاتے۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے تاکہ افراد خانہ خاص طور سے گھر کی بہوئیں دیکھ نہ لیں، طرح طرح کی کسرتیں اور یوگا کرتے ہیں اور نوجوانوں کی طرح جنس اور ٹی شرٹ پہنتے ہیں۔ اپنے پوتے کے سوال کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

عظیم مفکر اکس وائی زیڈ انسانی زندگی کو تین ادوار کے بجائے دو ادوار میں تقسیم کرنے کے حق میں ہیں۔ عالم شباب اور عالم خضاب اور اگر سچ پوچھئے تو دور حال کے منظر نامے میں ان کی باتوں میں ایک نہیں انیک پہلو سے کافی وزن ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بچپن اور جوانی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ہر بچے میں ایک بوڑھا اور ہر بوڑھے میں ایک بچہ چھپا ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے بچہ حسین سے حسین عورت کی گود میں بیٹھ جاتا ہے اور وہ عورت اسے اس کی معصوم خواہش اور پیار سمجھ کر برا نہیں مانتی اور کچھ بوڑھے بے جھجک کسی حسینہ کے کندھے اور سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور وہ اسے ان کی شفقت اور پیار سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے۔ دل کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک بات تمام بوڑھوں میں مشترک ہوتی ہے کہ وہ اندر سے

بہت رنگین ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کی مائیں اپنی لڑکیوں کو نوجوان مردوں سے زیادہ بوڑھوں سے محتاط رہنے کی ہدایت دیتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کا سب سے بہترین اور انجوائے کرنے کا دور بڑھاپے کا دور ہوتا ہے۔ اسی دور میں انسان کو رشتے کی پہچان آتی ہے۔ بچپن اپنے سے بڑوں کے احکام بجالانے اور کھیل کود میں گزر جاتا ہے۔ جوانی دوسروں کی ضروریات کی تکمیل میں بسر ہوتی ہے۔ سوطرح کے جھمیلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن بڑھاپا ہر فکر سے آزاد ہوتا ہے اور صرف اپنے لئے ہوتا ہے۔ بوڑھے شخص کو سبھی بے ضرر اور معصوم سمجھتے ہیں، اس لیے کھل کر کھیلنے اور لطف اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے غلط فعل پر بھی کوئی انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا، ہر محفل میں اس کی پزیرائی ہوتی ہے اور اگلی صف میں جگہ ملتی ہے۔ اگر اس نے عقلمندی سے کام لے کر بینک بیلنس اور جائداد اپنی مٹھی میں بند رکھا ہے تو اپنے گھر میں بھی اسے عزت ملتی ہے اور ناز اٹھائے جاتے ہیں۔ بیٹے، بیٹیا، بہویں، داماد، ناتی، پوتے ہتھیلی پر رکھتے ہیں اور اس کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، اگر وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر شدہ ہے تو اس کا رتبہ اور دو چند ہو جاتا ہے۔ بوڑھوں کے سر پر حکومت کا بھی دست شفقت ہوتا ہے۔ حکومت ان کے لیے مختلف سرکاری اسکیمیں جاری کرتی رہتی ہے۔ سرکاری محکموں میں ان کے کاموں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ سفر کے کرائے میں رعایت دی جاتی ہے۔ مذہبی مقامات کی مفت میں زیارت کرائی جاتی ہے۔ بوڑھے بہت سے لوگوں کی روزی روٹی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اگر بوڑھے نہ ہوں تو ڈاکٹروں کی کلینک کی آمدنی اور رونق ختم ہو جائے گی، دندان سازوں کو بیٹھ کر مکھی مارنا پڑے گا۔

جو لوگ بڑھاپے کی قدر نہیں کرتے اور بوڑھوں کو بوجھ سمجھتے ہیں وہ سخت نقصان کا سودا کرتے ہیں۔ یہ بوڑھے ہی ہوتے ہیں جن کے وجود سے گھر اور دنیا کی رونق قائم رہتی ہے۔ یہ اپنے خاندان کے رکھوالے ہوتے ہیں، اسی لیے کسی نے کہا ہے بوڑھا بوجھ نہیں دروازے کی ٹاٹ (پردہ) ہے۔ بوڑھا نہ رہے تو گھر دھوبی گھاٹ ہے ۔

نذیر آتی ہے آنے دو سفیدی اپنے بالوں پر
جوانی تم نے دیکھی ہے بڑھاپا کون دیکھے گا

❀❀❀

ایجاد غزل کے اسباب

سوال یہ اُٹھتا ہے کہ غزل گوئی کے لئے آخر سیدھا رستہ چھوڑ کر، اُلٹی چال چلنے کا باعث کیا ہے؟ سبب اس کا مشہور ہے کہ متبدی اس قابل نہیں ہوتا کہ شاعرانہ مضمون سوچ کر نظم کر سکے۔ آسانی کے لئے قافیہ و ردیف اسے بتائے جاتے ہیں۔ اب قافیہ کو ردیف کے ساتھ ربط دینے کے لئے اسے مختصر سا مضمون سوچنا پڑتا ہے جو دو مصرعوں میں تمام ہو جائے۔ مثلاً ''فرہاذ''، ''بہزاذ''، ''صیاذ'' قافیہ ہو تو وہی کوہ کنی، مصوری اور صیاد افگنی کا مضمون سامنے آئے گا۔ ''محمل''، ''بسمل''، ''منزل'' قافیہ ہو تو ''محمل''، لیلیٰ کی طرف اشارہ کرے گی ''بسمل'' قاتل کا پتہ بتائے گا اور ''منزل'' کے لئے جادہ تو پیش پا افتادہ ہے۔ غزل گو کہے ہوئے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے اور فخر اس بات پر کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ (وہ) لباسِ نو میں ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے ایجاد کا دوسرا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ معانی کو نئی نئی صورتوں میں دکھانے کی مشق پیدا ہو جائے۔ اس قیاس کے صحیح ہونے کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ جس زمانے میں غزل ایجاد ہوئی اُسی زمانے میں فن بلاغت کی تدوین وتہذیب ہو رہی تھی......ایک معنی خاص کے ادا کرنے کے فن بیان میں سینکڑوں طریقے ہیں، جب اس فن کی تعلیم کا رواج عالمگیر ہو رہا تھا، اسی زمانے میں غزل ایجاد ہوئی ہے یعنی جو پڑھیں اس کی مشق بھی کریں۔ سعدی کے زمانے سے لے کر اس وقت تک غزل کے مضامین ایک ہی طرح کے چلے آتے ہیں اور بار بار کہے جاتے ہیں۔ یہ سب مضامین عامتہ الورود ہیں، اس لئے کہ فطرت انسانی سب میں مشترک ہے......البتہ طرز بیان کا الگ الگ ہونا ضروری ہے۔ کلام میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ ایک تو اصل مضمون دوسرا طرز بیان۔ ان دونوں میں اصل مضمون کسی کا مال نہیں اس لئے کہ وہ ہر شخص کا مال ہے۔ ہاں طرز بیان اپنا الگ الگ ہونا چاہئے، ورنہ سرقہ کا الزام عائد ہوگا۔ طرز بیان ہی وہ چیز ہے جس کے لئے علمائے اسلام نے فن بیان کو ایجاد کیا اور غزل گویوں نے اس مشق کو حد اعجاز تک پہنچا دیا۔ (اخذ وتلخیص صوت تغزل، نظم طباطبائی)

منظومات

ایم۔ایچ۔تابشؔ رُدولوی

17/9Q.A, Moh. Pura Basawan Rudaulvi,Ayodhya - 224120 (Mob. 9580228003)

بڑی شان والا ہے ربّ قدیر

کہاں یہ مرا منھ ، کہاں تیری ذات   میں ادنیٰ تصور ، تو اعلیٰ صفات
ہنر بھی دیئے اور کمالِ فنون   الٓمٓ قٓ حٰمٓ نٓ
یہ دھرتی یہ امبر یہ تاروں کا جال   یہ مشرق یہ مغرب ، جنوب اور شمال
مزین تجھی سے ہیں یہ شش جہات   ترے ہی تجسس میں ہے کائنات
بڑی شان والا ہے ربِّ قدیر   نہ تمثیل اُس کی نہ کوئی نظیر
دیا دین حق تو ہدایت بھی دی   نبیؐ بھی دیے اور نبوت بھی دی
یہ بندہ ہوا جب خدا کے حضور   عبادت میں کچھ اور آیا سرور
خدا سب کمالوں میں ہے باکمال   بڑا رحم والا ، بڑا ذوالجلال
یہ موسم ، یہ موسم کی انگڑائیاں   یہ فصل بہاراں ، یہ رعنائیاں
یہ بارش کی بوندیں یہ ابر بہار   یہ اُڑتی ہوئی تتلیوں کی قطار
یہ پانی ، ہوا ، آگ یہ خشک و تر   یہ ندیاں ، یہ جھرنے ، شجر اور حجر
یہ پھل ، پھول ، کلیاں یہ حسن و شباب   یہ سورج یہ کھلتا ہوا ماہتاب
یہ ماں باپ ، اولاد بھائی بہن   یہ گھر یہ گھرانہ ، یہ آنگن صحن
مسبّب بھی تو ہے اور اسباب بھی   تو ہی حسن تعبیر اور خواب بھی
یہ صحرا ، یہ اُڑتی ہوئی ریگزار   یہ جھرنوں سے بہتے ہوئے آبشار
پہاڑوں پہ چڑھتی ہوئیں چیونٹیاں   یہ رس سے بھری شہد کی مکھیاں
کھڑے ہیں زمیں آسماں پر سکون   نہ دیوار کوئی نہ کوئی ستون
شریعت بھی دی اور قرآن بھی   تحمل بھی بخشا ہے ، ایمان بھی
الٓمٓصٓ یٰسٓ قٓ   تری نعمتیں ہیں ، مرا اعتراف

نعت اقدس

ذاکرہ شبنم

R.S.Foot Wear, Shop No.192, M.G. Market, Robertsonpet-K-G-F- 563122, Karnataka (Mob. 9916969954)

رسولِ خدا بے مثال اللہ اللہ
محمد کا حسن و جمال اللہ اللہ
نہیں نام ظلمت کا باقی جہاں میں
محمد کی آمد کمال اللہ اللہ
ملا آپ کے دَر سے انصاف سب کو
محمد میں تھا وہ جلال اللہ اللہ
معافی ، مروت رہا جن کا شیوہ
نہیں اُن کے جیسی مثال اللہ اللہ
یتیموں کو اپنے گلے سے لگایا
دیا ان کو مال و منال اللہ اللہ
جنھوں نے دیا درسِ الفقر فخری
انہیں سے ہیں ہم مالامال اللہ اللہ
شفاعت کا وعدہ کیا روزِ محشر
محمد کی امت نہال اللہ اللہ
تری دید کی چاہ کس کو نہیں ہے
مجھے بھی یہ آیا خیال اللہ اللہ
عطا ہو شرف نعت گوئی کا شبنم
یہی ٹھہرے میرا کمال اللہ اللہ

❀❀❀

رابعہ نوری

Oriental College, Patna City, Patna - 800008

دل ہے آقا کی محبت کے لئے
لب ملے ہیں اُن کی مدحت کے لئے
روضۂ اقدس پہ ہر شام و سحر
آتے ہیں قدسی زیارت کے لئے
کیوں نہ ان کی نعت سے رکھوں شغف
یہ وسیلہ ہے شفاعت کے لئے
خاک طیبہ لائی ہے باد صبا
رکھ اسے آنکھوں کی زینت کے لئے
ہے عرب شاہد کہ پہنچے ہیں حضور
دشمن جاں کی عیادت کے لئے
اک نظر آقا اِدھر بھی ڈالئے
ہاتھ پھیلائے ہیں رحمت کے لئے
میرے دفتر جب کھلیں گے حشر میں
آپ کافی ہیں وکالت کے لئے
بدر میں پہنچی فرشتوں کی کمک
دین احمد کی حمایت کے لئے
خوش ہو نوری غم نہ کر اب آگئے
شافع محشر شفاعت کے لئے

❀❀❀

سلطان احمد ساحلؔ

Moh. Minhaj Nagar, At&P.o. Phulwarisharif, Patna 801505 (Mob. 9135707097)

چار نظمیں

اَنمول یاترا

بے فکری کے وہ دن
پتہ نہیں کہاں گئے
حساب کتاب کے
کسی فارمولے کی طرح
جوڑ گھٹاؤ کی، تلاشِ گمشدہ کی زندگی
بے حس جذبات سے
خالی پن لئے ہوئے
رشتوں میں بھی
نفع اور نقصان کا پہلو لئے
احساس اور سکون کو
بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں
اونچی اونچی بلڈنگوں میں
کراہتی، کانپتی اور مسکراتی زندگی
خود سے خود کو الگ کر کے
انسان کی انسانیت
ٹکڑوں میں بٹ کر
ہنسی، خوشی اور کرب کو سمیٹ کر
گھروں میں سمٹ کر
جینے کا عادی، انسان ہو گیا ہے

آفتِ ناگہانی

آفت، دُکھ اور مصیبت
یکا یک یہ بھی احساس دلاتے ہیں
کہ کسی کے سکھ اور دُکھ، الگ نہیں ہوتے
بچھڑنے کی تکلیف اور ملنے کی خوشی
سبھوں کی ایک جیسی ہوتی ہے
بھوک، سردی، گرمی اور پیاس
اور اپنوں کا ساتھ، الگ نہیں ہوتا
راحت کی کوئی، ذات پات نہیں ہوتی
ڈوبتے کی طرف مدد کو بڑھے ہاتھ کا
کوئی رنگ نہیں ہوتا
اور نہ ہی کوئی پوچھتا ہے کہ
وہ سجدے میں گرا ہے
یا پرارتھنا میں کھڑا رہتا ہے
قدرت کا قہر، اپنا آئینہ دکھا ہی دیتا ہے
آنسو کبھی شیشہ ہے، کبھی پانی ہے

یہ عشق عشق......

عشق کے عنصر، نہ صرف انسانوں میں
بلکہ تمام نباتات، حیوانات
اور جمادات میں پنہاں ہیں
چھوٹے چھوٹے ذرّات
عشق ہی کے سبب، آپس میں مل کر
کوہِ ہمالیہ کی شکل میں
اپنے اپنے مقام پر صدیوں سے
قائم ودائم ہیں
عشق ہی کے سبب
زمین سے پانی کا عمیق رشتہ ہے
شمس وقمر اپنے محور پر
رات دن گردش میں ہیں
عشق کانٹوں میں بھی
پھول بن کر کھلتا، چمکتا
اور خوشبو بن کر، مہکتا ہے

وقت کی طوالت

موسم اور وقت
کسی کے دُکھوں کی پرواہ نہیں کرتا
موسم اور وقت کی بے نیازی
انسان کا سب سے بڑا دُکھ ہے،
اور وقت کی طوالت زخموں کا مرہم ہے

❀❀❀

شکیل اختر

Ansar Ganj, Sasaram, Dist. Rohtas - 821115 (Bihar)

مشقِ سخن

غزل کہتا ہوں، میرا شوق ہے یہ
تقاضا ہے یہ میرے اندروں کا
سنو حاضر مری تازہ غزل ہے
یہ کہتے ہیں مگر احباب میرے
سناتے ہو اگر کوئی غزل تم
تمہارے شعر پھر بنتے ہیں کیسے؟
کبھی حیرت سے مجھ سے پوچھتے ہیں
کتابیں فن کی کیا تم نے پڑھی ہیں؟
میں کہتا ہوں جواباً، عرض ہے یہ
غزل کہتا ہوں، میرا شوق ہے یہ
یہ راحت ہے مری، میری خوشی ہے
غزل کہتا ہوں میں، کہتا رہوں گا
درِ تخلیق یوں کھلتا نہیں ہے
ضرورت ہے کہ پیہم کوششیں ہوں
یہی محنت تو کنجی شعر کی ہے
ارادہ اب یہی رکھتا ہوں آگے
رہے جاری مرا مشقِ سخن یہ

❁❁❁

نیلوفر پروین

C/o Rafi Haider Anjum, Gachi Tola, Arraia (Mob. 7294941132)

تھوڑی سی مہلت

مجھے تھوڑی سی مہلت دو کہ میں اپنا وعدہ کر سکوں پورا
وہ وعدہ جو کیا ہے میں نے
اپنی بے خواب راتوں سے، چاند تاروں سے
تم بھی تو چاند جیسے ہو، جیسا سوچا تھا میں نے، ویسے ہی ہو
مجھے تھوڑی سی مہلت دو کہ ابھی رات کی سیاہی مٹی نہیں ہے
کہ ابھی صبح کا تارا ڈوبا نہیں ہے
کہ ابھی تمہارے قدموں کی آہٹ سنی نہیں ہے
وہ آہٹ جو دبے پاؤں چلی آتی ہے
وہ مسکراہٹ جو کلیوں کو بھی شرماتی ہے
میں ایک آہٹ کی خاطر کیوں اتنا بے حال رہی
اُسی ایک مسکراہٹ کی خاطر، کیوں روز و شب پامال رہی
مجھے تھوڑی سی مہلت دو کہ خوابوں کی حقیقت ذرا سمجھ لوں
کہ چاند کو پانی میں اُترا ہوا ذرا دیکھ لوں
چاند کو چھونے کی تمنا کی سزاوار ہوں میں
تمہاری مجرم ہوں، خطاوار ہوں میں
مجھے تھوڑی سی مہلت دو کہ تمہیں بھولنے سے پہلے
اپنے دل کی دھڑکنوں کو گن لوں
ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں تو چن لوں

❁❁❁

غزلیں

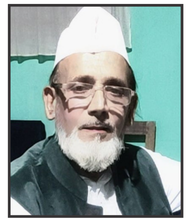

اعجاز مانپوری
Gaya (Bihar)

میرے آنے کی اگر اس کو خبر ہو جائے
رات اس کی بھی سلیقے سے بسر ہو جائے
روح کی آگ سے جب تیرا گزر ہو جائے
پھر تیرے جینے کا انداز دگر ہو جائے
ظلم کا تیر بھی ٹکرا کے پلٹ جائے گا
حوصلہ بڑھ کے اگر سینہ سپر ہو جائے
سجدۂ شکر کو جھک جائے گی ٹہنی ٹہنی
دل کا یہ پیڑ ثمردار اگر ہو جائے
داستاں عشق کی لکھوں گا تری پلکوں پر
تیری آنکھوں میں اگر میرا بھی گھر ہو جائے
اس کے سائے میں سکوں پائیں مسافر سارے
تنکا تنکا اگر شاداب شجر ہو جائے
میں تو مہماں ہوں دنیا میں فقط دو دن کا
کیا بڑی بات جو دو دن بھی گزر ہو جائے
عشق کی آگ میں اعجاز جھلسنا سیکھو
پھر تو کانٹوں پہ بھی چاہو تو بسر ہو جائے

❁❁❁

آزاد سونی پتی
New- E-506 Rainbow Vistas, Rock Garden,
Green Hills Road, Hariram Hills, Moosa PET
Hyderabad - 500072(Mob. 7021724853)

جو انساں اپنے پیروں پر کھڑا ہے
زمانے کی نظر میں وہ بڑا ہے
سحر تا شام وہ ضد پر اڑا ہے
بشر اس دور کا چکنا گھڑا ہے
ہے پایا جس نے ارمانوں پہ قابو
حقیقت کی لڑائی وہ لڑا ہے
جو تو لکھنے لگا ہے سچ کی بھاشا
کوئی اب جھوٹ کیا تازہ گھڑا ہے
وہ ہر اک گام ٹھکرایا ہے جاتا
گلی میں جیسے کہ پتھر پڑا ہے
اسی کو اہمیت دیتی ہے دنیا
جو اپنے وہم کی خاطر لڑا ہے
زمانے نے اسے مانا ہے رہبر
زمانے میں جو بھی خود سے لڑا ہے

❁❁❁

فہیمؔ سہسرامی

Moh. Nooranganj, P.o. Sasaram, Dist. Rohtas - 821115 (Mob. 7050116954)

غزلیں

کیوں اپنے ہاتھ کی لکیروں کو گنتے ہیں
صبح اٹھتے ہی خوابوں کی تعبیر بنتے ہیں
اب کسی سے ملنا بھی عجیب لگتا ہے
بے سبب بھی کسی پہ تہمت لگا سکتے ہیں
اب اپنوں کی بھی پہچان کر نہیں پاتا
اس لئے کہ اپنے بھی اجنبی لگتے ہیں
کسی بات پر کسی پہ بھروسہ مت کرنا
جب موسم کی طرح لوگ بدل سکتے ہیں
زیادہ تر فسردہ چہرے نظر آتے ہیں فہیمؔ
اُمرا کے رہتے ہوئے بھی بے کس سسکتے ہیں

❁❁❁

ضرورت ہے خلوص کے چراغ جلانے کی
ضرورت ہے نفرتوں کی دیوار گرانے کی
جس خلوص کی بدولت کائنات چلتی تھی
ضرورت ہے ویسی تحریک چلانے کی
کیا شئے ہے احترام وہ جانتے نہیں
ضرورت ہے یہ جوانوں کو بتانے کی
زندگی کے سفر میں کامیابی کے واسطے
ضرورت ہے ماں سے دعا کرانے کی
اب رشتہ سے اتنی دوری ہوئی فہیمؔ
عادت ہوگئی ہے بھول جانے کی

❁❁❁

ذکرِ گل

برسوں سے گل چمن میں نکلتے ہیں رنگ رنگ　نکلا نہیں ہے اک رخِ یار سا ہنوز　(میرؔ)
نہ گل کو ثبات ہے نہ ہم کو ہے اعتبار　کس بات پر چمن میں ہوس رنگ و بو کریں　(دردؔ)
ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ　اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے　(ذوقؔ)
اس رشک گل کے جاتے ہی آگئی خزاں　ہر گل بھی ساتھ ہو کے چمن سے نکل گیا　(ناسخؔ)
بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر　کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سارے چمن میں تھی　(فانیؔ)
بڑھ جائے گی عزت گل و نسرین وسمن کی　لائی ہے چمن میں انہیں تقدیر چمن کی　(حسرتؔ)
کس سے پیمانے وفا باندھ رہی ہے بلبل　کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت　(حالیؔ)
کیوں آتش گل میرے نشیمن کو جلائے　تنکوں میں ہے خود برق چمن زار کا عالم　(جگرؔ)

توقیرعالم توقیر

Asstt. Prof., Depttt. of Urdu, Maulana Mazharul Haque Arabic & Persian University,

Patna 800001 (Mob.9430818387)

غزل

درد کا داغ کا نالہ فریاد کا کوئی زخم جگر کا سوالی نہیں
اس خیابان دل سے کہاں جایئے ، ایسی جنت کہیں ملنے والی نہیں
ہم نبھاتے رہے رسم الفت سبھی زلف کو رات کہہ کر سنوارا کئے
تیری دنیا منور رہے چاند سی ، ہم نے خود اپنی دنیا اجالی نہیں
تاب دل رنجشوں سے فزوں تر ہوئی اشک بن کر نگاہوں سے بہنے لگی
ہم نے مانا یہ خاکی بدن ہے مگر دل کا موتی یہ ہرگز سفالی نہیں
گرد جمتی گئی آئینہ آئینہ صورتیں مسخ ہوتی رہیں دم بہ دم
ہم نے دیکھا نہیں آئینہ پھر کبھی کوئی صورت بھی اس نے اچھالی نہیں
پیاس بڑھنے لگی خشک لب ہوگئے اور نگاہوں میں ذرّے چمکنے لگے
بام صحرا سے اترو کہ گھر کو چلیں ریگ زاروں میں آب زلالی نہیں
ملتجی ہے نظر دل پریشان ہے کوئی سایہ شجر کا نہیں دور تک
زندگی کا سفر درد پیہم ہے یا دشت ایسا ہے جس میں غزالی نہیں
ایک ایسا تماشا ہے کار جہاں حسرتوں کے سوا کچھ نہیں ہے یہاں
ٹوٹ کر کیوں بکھرنا مرے ہم نشیں آؤ سوچیں یہ دنیا نرالی نہیں
روز شمس و قمر پھر رہے ہیں اِدھر اور سیر مکافات میں ہم اُدھر
عقدۂ جاں تمنا سے معمور ہے دل بھی توقیر امکاں سے خالی نہیں

❁❁❁

زویا شاہیںؔ

B-204, Begum Sultan Jahan Hall, Firdous Nagar, AMU, Aligarh- 202002

غزلیں

وہ روشنی ہے میرے دلِ داغدار میں
اک شمع جل اُٹھی ہے تری رہ گزار میں
یوں زندگی کی دھوپ میں آئی ہے تیری یاد
جیسے ہو سایہ دار شجر رہ گزار میں
خود ہی غریب شہر کا پوچھے کبھی مزاج
وہ بات ہی نہیں ہے مرے شہریار میں
کوئی بتائے کس کو ملی منزلِ یقیں
میں تھک چکی ہوں چل کے رہِ اعتبار میں
دنیا کی رونقیں نہ لبھا پائیں گی اُسے
گم ہو چکا جو جلوۂ پروردگار میں
دست ستم نے چاک کیا ہے قبائے گل
رقص خزاں یہ کیسا ہے فصل بہار میں
شاہیںؔ گلوں میں بوئے وفا ڈھونڈتی ہو کیوں
لمس خلوص ملتا ہے اب نوکِ خار میں

❁❁❁

دلِ ناکام لے کر کیا کروں گی
شکستہ جام لے کر کیا کروں گی
امیدوں کا کوئی سورج تراشوں
چراغِ شام لے کر کیا کروں گی
میں کر دیتی ہوں دریا برد نیکی
وفا کا دام لے کر کیا کروں گی
تجھے فنکار کی پہچان کب ہے
ترا انعام لے کر کیا کروں گی
یقیں کی فصل بونا کام میرا
خیالِ خام لے کر کیا کروں گی
وہ آئیں تو بہارِ دید بھی ہو
ادھوری شام لے کر کیا کروں گی
کبھی آغاز کی نوبت نہ آئی
میاں! انجام لے کر کیا کروں گی

❁❁❁

تلمیحات
نظمؔ طباطبائی

جو نازاں مردم آزاری پہ ہو اُس کو یہ دو مژدہ
نعمت خلت کا جب سے ذوق میرے دل کو ہے
چہرہ اُترا ہی چلا جاتا ہے اُس کا شرم سے
مسند فکر کا اپنی ہے وہ رتبہ اے نظمؔ
رشک فغفور نہ ہم رتبہ خاقاں ہوتا

اجارہ چیونٹیوں کو مل گیا گور تہمتن کا
خوانِ ابراہیم پر اک اور مہماں بڑھ گیا
کام کرتی ہے نزاکت مانی و بہزاد کی
نہ تو قیصر اُسے پہنچا نہ تو کسریٰ پہنچا
آدمی کچھ بھی نہ ہوتا مگر انساں ہوتا

مشتاقؔ سیوانی

New Khajoor Banna, Patna (Mob. 9304693513)

غزلیں

نقش کردار کے بھی ہوتے ہیں
طرز گفتار کے بھی ہوتے ہیں

سب سے اچھی جگہ حرم ہے مگر
بھاؤ بازار کے بھی ہوتے ہیں

گفتگو کیجئے اشاروں میں
کان دیوار کے بھی ہوتے ہیں

ایک مضمون میں کئی معنی
میرے اشعار کے بھی ہوتے ہیں

پھول کے شہر میں پس پردہ
ذکر تلوار کے بھی ہوتے ہیں

دوستو جنگ میں اُصولوں کی
کچھ سبب ہار کے بھی ہوتے ہیں

تلخیٔ زندگی کی راہوں میں
مرحلے پیار کے بھی ہوتے ہیں

اہل دل ہی سمجھتے ہیں مشتاقؔ
لطف تکرار کے بھی ہوتے ہیں

❁❁❁

حق کی پہچان کون کرتا ہے
سچ کا اعلان کون کرتا ہے

ذکر میزان کون کرتا ہے
اپنا نقصان کون کرتا ہے

عیش و عشرت کی فکر ہے سب کو
غم کا سامان کون کرتا ہے

جس طرف حاکموں کا ہے حاکم
اس طرف دھیان کون کرتا ہے

دیش بھگتی کا سب کو ہے دعویٰ
خود کو قربان کون کرتا ہے

لوگ ملتے ہیں اپنے مطلب سے
یوں ہی احسان کون کرتا ہے

شوق شیشہ گری کا ہے سب کو
کام آسان کون کرتا ہے

آج مشتاقؔ ایک تیرے سوا
ذکر سیوان کون کرتا ہے

❁❁❁

منوّر داناپوری

Shah Toli, Danapur Cantt. Patna - 801503 (Mob. 8789946411)

غزل

یوں فکر و فن کا ترے بھی کوئی جواب نہیں
تو جس فلک پہ ہے واں کوئی آفتاب نہیں
تو علم و فن کا مکمل نظامِ شمسی ہے
بکھر جو جائے فضا میں ، تو وہ شہاب نہیں
ادب کہ حکمت و تاریخ و فلسفہ و نجوم
تری حیات میں ان کا ہی انتخاب نہیں
وہی فلک وہی تابندہ چاند تارے ہیں
اور ایک تو ہے کہ جس میں وہ آب و تاب نہیں
ہر ایک شعبے میں اسلاف کا ابھی بھی ہے ذکر
کہ اس سے خالی تو تاریخ کی کتاب نہیں
بھلایا تم نے بھی بیرونی ، رازی ، سینا کو
سبق میں ان کا تمہارے کوئی نصاب نہیں
فنا کریں گی بھی کیسے یہ موج و لہر تجھے
تو اک سفینہ ہے ہمدم کوئی حباب نہیں
ہیں آگے پیچھے جو سیارگان گردش میں
یہ سب ہیں تجھ سے منوّر یہ ان کی تاب نہیں

***

حافظ محمد تمنّا

Phulwarisharif, Patna

قطعات

زندگی ہے تو دمکتے رہنا
غم کی منزل میں چمکتے رہنا
اے تمنّا ہو تری عمر دراز
باغِ ہستی میں چہکتے رہنا

***

مرنا جینا حرام کرتے ہیں
کب مرا احترام کرتے ہیں
دل تعصب میں ہے اسیر اُن کا
میرا قصہ تمام کرتے ہیں

***

ہر اک ہستی عبادت کی طرح تھی
شکایت بھی محبت کی طرح تھی
اسیر عشق تھے شیخ و برہمن
سیاست بھی بصیرت کی طرح تھی

***

گماں کا عکس مری چشم اعتبار میں ہے
حیاتِ شوق ابھی جانے کس شمار میں ہے
کبھی تو ہوگا میسر سکون کا لمحہ
دلِ تمنّا تغیر کے انتظار میں ہے

***

نام کتاب	:	بنت فنون کا رشتہ
شاعر	:	بدؔر محمدی
ناشر	:	آدم پبلشرز، دریا گنج، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۲ء
صفحات	:	۲۷۶ قیمت : ۳۵۰ روپے
مبصر	:	شکیؔل سہسرامی

تبصرے کے لئے اس وقت جو کتاب پیش نگاہ ہے اس کی نوعیت دیگر کتابوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس کتاب میں نثر اور نظم دونوں شامل ہے۔ نثر دوسروں کی ہے اور شاعری خود مصنف جناب بدؔر محمدی کی ہے۔ یہ کتاب اصلاً غزلوں کا مجموعہ ہے اور اس کا پورا نام ''بنت فنون کا رشتہ مع تبصرہ وتجزیہ'' ہے۔ اس مجموعہ غزل کی پہلی اشاعت ۲۰۱۱ء میں ہوئی تھی اور مسرت وحیرت کا مقام ہے کہ ایسے دور میں جہاں اردو کتابوں اور خصوصاً شعری مجموعوں کی پہلی اشاعت کے نسخے ہی برسہابرس اپنی نکاسی کے منتظر رہتے ہیں، اس کتاب کا محض گیارہ برسوں کے بعد یہ دوسرا ایڈیشن نہایت آب وتاب سے شائع ہوا ہے۔

یہ کتاب ''سلطنت شعر وسخن کے باذوق شہزادوں کے نام منتسب'' ہے۔ کتاب کا آغاز بدؔر محمدی کے ''حرف اوّل'' سے ہوتا ہے جو چار صفحات پر مشتمل ہے۔ ''حرف اوّل'' کے مطابق اردو شعر وادب زوال پذیر نظر آتا ہے۔ اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی نظر آرہی ہے۔ نثر نگاری کارِ جبر، شعر گوئی اَنا کی تسکین کا عمل اور شعری مجموعوں کی اشاعت منتشر خیالات کو یکجا کرنے کی صورت محض ہے۔ گویا اس کتاب کے مصنف وشاعر بدؔر محمدی اردو زبان وادب کے مستقبل سے خوش نہیں بلکہ افسردہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب غزلوں کا مجموعہ اور اس کے نام میں ''بنت فنون'' سے اسی صنف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ غزل کو ''بنت فنون'' یعنی فنون کی بیٹی کہنا، میرے خیال میں ہر لحاظ سے درست ہے، کیوں کہ غزل کی تعریف ہی ہے ''باز نان سخن کردن'' عورتوں سے، لڑکی یا محبوبہ سے اس گفتگو کو شاعر فنی طور پر مقفٰی اور مرصع بنا دیتا ہے جو شاعری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ مثلاً ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کہنے کی ضرورت نہیں کہ مومن خاں مومؔن کے اس شعر میں ''تم'' معشوق ہے اور ''تم'' کا کہنے والا عاشق ہے۔

''بنت فنون کا رشتہ'' میں ۲۷ نثری تاثرات ہیں اور پانچ منظوم اظہار خیال اور لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ مصنف، مولف، شاعر اور تدوین کار بدؔر محمدی صاحب کے بارے میں ہے۔ یقیناً یہ ان کی بڑی کامیابی ہے اور زمانے کے اعتبار سے ایک نعمت عنقا جو نہیں میسر آئی ہے۔

۲۷۶ صفحات کی اس کتاب میں ۱۵۴ صفحات پر مشتمل نثری رشحات قلم کے بعد بقیہ ۱۲۲ صفحات میں اس کتاب کے شاعر بدؔر محمدی کی شاعری ہے جو بلاشبہ پڑھنے اور حظ اٹھانے کے قابل ہے۔

اس کتاب کے ۲۷ مبصرین اور تجزیہ کاروں میں پہلا نام سید شکیل دسنوی کا ہے۔ دسنوی صاحب کے مطابق بدؔر محمدی کے اشعار میں کلاسیکی رچاؤ اور جدت طرازی کا خلاقانہ امتزاج عہد حاضر کے نو کلاسیکی لب و لہجے کا عکس بردار ہے۔ وہ ایک فطری رومانی شاعر ہیں۔ ظفر عدیم کی نظروں میں بدؔر محمدی کی شاعری رجائیت پسندی کا آئینہ ہے۔ وقار قادری کے خیال سے بدؔر محمدی اپنی شاعری میں عرفان صدیقی کی راہ اپناتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خالدہ خاتون کی نظر میں بدؔر محمدی شاعری حصول شہرت کے لئے نہیں بلکہ تسکین دل اور فروغ اردو کے لئے کرتے ہیں۔ ''ادبی محاذ'' کے روح رواں سعید رحمانی لکھتے ہیں کہ بدؔر محمدی کا اپنا اسلوب اور انداز ان کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ ان کی شاعری پر کسی قسم کے ازم کا

لیبل چسپاں نہیں،ان کی شعری کائنات متنوع موضوعات سے مزین ہے۔
نذیر احمد یوسفی کی رائے کے مطابق بدؔر محمدی کی شاعری موجودہ زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں پر محیط ہے۔ وہ ادبی تحریکات سے کماحقہٗ آگاہ ہیں اوراپنے فکری وفنی محاسبہ سے بخوبی واقف۔
ڈاکٹر معراج الحق برقؔ کی نگاہوں میں بدؔر محمدی ایک ذہین و فطین، سنجیدہ اور سعادت مند قلم کار ہیں۔انہیں علم وفن اور شعروادب سے غیر معمولی شغف ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے توسط سے مذہبی، معاشرتی ،نفسیاتی اور معاشی گوشوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ پروفیسر منظر اعجاز کے بقول بدؔر محمدی شاعری میں سادہ بیانی کو اہمیت دیتے ہیں اور خود بھی سادہ بیان شاعر ہیں۔ وہ اپنی سادہ بیان شاعری میں اس قدر محو اور مست ہیں کہ کسی ستائش یا صلے کی پروانہیں کرتے۔ وہ سلاست اور پرکاری سے اپنی شاعری کو دلنوازی کا سامان بھی بنانا چاہتے ہیں۔مثلاً؎

آسمانِ نظر کا چاند ہے تو
ارضِ دل پر ہے چاندنی تیری

پروفیسر جاوید حیات کے مطابق بدؔر محمدی کی غزلوں میں کسی نہ کسی صورت میں نورِ ازل نظر آتا ہے۔ان کی شاعری ہمیں زندگی کے پاس ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ پروفیسر ہمایوں اشرف کا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ بدؔر محمدی کے بیشتر اشعار میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ شعر کا بنیادی آہنگ ٹوٹنے نہ پائے ،لیکن یہ رائے ایک نقاد کی ہے شاعر کی نہیں ہے،اس لئے غیر شاعر نقادوں کی شعرا کے تئیں طے کی گئیں آراء میرے خیال سے سند اعتبار کلی طور سے نہیں رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق بدؔر محمدی شاعری میں زمانے کی تلخیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، حالاں کہ یہ بات کم وبیش ہر شاعر کے یہاں ملتی ہے۔
زماں قاسمی صاحب کا تجزیہ بتاتا ہے کہ بدؔر محمدی کے کلام میں دلکشی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان کی نہایت ہی اچھی صلاحیت موجود ہے۔ان کے اشعار میں تلمیحاتی گونج بھی سنائی دیتی ہے جو اسلامی پس منظر سے اُن کی واقفیت اور اُن کے وسیع مطالعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بدؔر محمدی کی شاعری ابہام کی شاعری نہیں بلکہ آج کی پر پیچ زندگی کی شاعری ہے، جہاں زندگی کا ہر لمحہ مشکلوں، ٹھوکروں اور

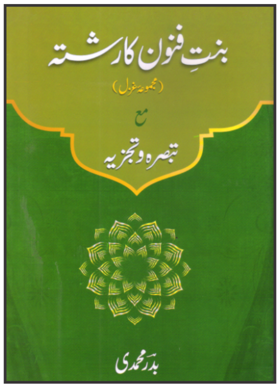

مصائب وآلام سے نبرد آزما نظر آتا ہے۔اظہر نیر صاحب فرماتے ہیں کہ بدؔر محمدی کی شعری کائنات متنوع موضوعات سے مزین ہے جس میں اسلوب کی شگفتگی، زبان و بیان کی سادگی وسلاست، ندرت و تازگی خصوصی طور پر نظر آتی ہے جو ان کی شعری کامیابی کی ضامن ہے۔
افتخار عظیم چاندؔ صاحب بتاتے ہیں کہ بدؔر محمدی نے اپنے اشعار کے ذریعہ عجز وانکساری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔انہیں اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ اپنی زبان اردو سے بھی والہانہ لگاؤ ہے۔ بدؔر محمدی کے تعلق سے منیر سیفؔی صاحب لکھتے ہیں کہ وہ ایک خوش فکر اور تازہ کار شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں امنگ، ولولہ اور زندہ دلی کے ساتھ بدر کامل کی روشنی بھی محسوس کی جاسکتی ہے جو حالات حاضرہ کی عکاس ہے۔ بدؔر محمدی کا دائرہ کار شعری مجموعہ کی اشاعت تک ہی محدود نہیں۔ وہ شاعر کے ساتھ ساتھ مبصر اور ناقد بھی ہیں۔سیفؔی صاحب نے بدر محمدی کے دواشعار بھی نقل کئے ہیں؎

بدؔر مردِ تخیلات تو ہے
ماہر لفظیات ہو کہ نہ ہو

لگتا ہے بدؔر شاعر جادو بیاں مجھے
یہ تبصرہ ہے اپنا کوئی جائزہ نہیں

بدؔر محمدی کے ہم وطن انوار الحسن وسطوی صاحب لکھتے ہیں کہ بدؔر محمدی ایک وسیع المطالعہ ادیب، خوش فکر شاعر اور بسیار نویس قلمکار کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔اُن کے کلام میں جدید ذہن کی کارفرمائی ہے۔اُن کے اشعار صاف ستھرے اور دل کو چھو لینے والے ہوتے ہیں۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، چنانچہ انہوں نے خود کو غیر اسلامی اور غیر اخلاقی افکار وخیالات کے اظہار سے بہر حال بچایا ہے۔ جدید غزل گوئی میں دوسروں کی طرح یہ بھی اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں؎

ہے روشنائی سے اے بدؔر آشنائی تمہیں
تمہارا نام قلم کے جہاں میں روشن ہے

بےؔنام گیلانی صاحب نے یہ محسوس کیا کہ بدؔر محمدی کے یہاں کچھ حقائق ایسے موجود ہیں جو نئے اور تازہ کار تو نہیں، لیکن جو بھی جس حال میں بھی ہیں وہ یقینی طور پر متاثر کن ہیں۔ بدؔر نے تلمیحاتی اشعار کو ادب کا جامہ پہنایا ہے جو قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر معصوم رضا امرتھوی کی فکر بتاتی ہے کہ موصوف کی شاعری محض تفنن طبع نہیں ہے، بلکہ وہ دعوتِ فکر بھی دیتی ہے اور زمانے کی برائیوں کے خلاف پرچم احتجاج بھی بلند کرتی نظر آتی ہے۔ بدؔر محمدی نے فصاحت و بلاغت پر خصوصی توجہ دے کر احساسات و جذبات کو دلکش اور اچھوتا بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر بسمؔل عارفی کی فکر کے مطابق بدؔر محمدی نے اپنی شاعری میں زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کو سمونے کی کوشش کی ہے، وہ ایک اچھے اور سنجیدہ غزل گو شاعر ہیں، ان کی شاعرانہ عظمت کا لوگوں نے اعتراف کیا ہے۔ عاقل زیادؔ کے محسوسات کے تناظر میں بدؔر محمدی کی شاعری سے مایوسی نہیں ہوتی بلکہ ایک نئی امید جاگ جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں کیفیاتی وجد اور جمالیاتی پیکر ابھر کر سامنے آتا ہے ؎

آ بسا ہے غم کسی کا جان میں
گھر گیا ہوں میں حسیں طوفان میں

ڈاکٹر ظفر انصاری ظفؔر کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ڈاکٹر بدرالزماں بدؔر محمدی کی شعری کائنات یک موضوعی یا اکہرے معنوی سیاق سے عبارت نہیں، بلکہ اس میں محتویات کی رنگارنگی، افکار کی طرفگی اور خیالات کی بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری احساس وادراک کے جذبے کو بیدار کرتی ہے اور ثقافتی منظر نامے کے استحضار میں سرگرم دکھائی دیتی ہے، اس حوالے سے ان کا یہ شعر دیکھئے ؎

صبح تک ساتھ مرے چاند ستارے جاگے
میری بے تابی انہیں رات سمجھ میں آئی

معراج احمد معراؔج کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بدؔر محمدی کی سلطنت شعر وسخن وسیع وعریض ہے۔ انہوں نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے، وہ زندگی کے نشیب وفراز سے جڑے ہوئے ہیں، یہ شعر دیکھئے ؎

نا امیدی نہیں آس ہے زندگی
ہو یہ احساس تو پاس ہے زندگی

ڈاکٹر بختیار نواز کی چشم احساس یہ بیان کرتی ہے کہ بدؔر محمدی کا احساس نیند کی چادر میں لپٹا ہوا نہیں بلکہ ان کی شاعری میں فنی بالیدگی اور ذہنی پختگی بہر صورت نظر آتی ہے ؎

فیصلہ اس نے کیا ہے ایک رُخ کو دیکھ کر
دوسرا رُخ بھی مگر موجود ہے تصویر میں

ڈاکٹر صوفیہ پروین کہتی ہیں کہ بدؔر محمدی شعر گوئی کے ہنر سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری آفاقی معلوم ہوتی ہے ؎

ہر نظر غزنوی صفت ٹھہری
تن بدن سومناتھ ہے اس کا

خوبرو وہ شخص کچھ ایسا لگا
پھر کوئی چہرہ نہیں اچھا لگا

ڈاکٹر عبدالودود قاسمی کی نگاہوں میں بدؔر محمدی کی شاعری درد وکسک، سماجی مسائل، عصر حاضر کی تلخیوں، ناکامیوں، محرومیوں، بدلتے ہوئے حالات اور اخلاقی گراوٹ جیسے مختلف موضوعات کی جلوہ گری کی آئینہ دار ہے۔ انہیں حساس طبقے کا شاعر کہا جا سکتا ہے ؎

خدمت شعر و شاعری میں رہوں
بندۂ فن ہوں بندگی میں رہوں

ڈاکٹر منصور خوشتؔر کے مطابق بدؔر محمدی کی شاعری فرحت کا احساس دلاتی ہے۔ ان کے یہاں نئی نئی تراکیب اور علائم کی مثالیں جابجا مل جاتی ہیں ؎

ہو فائدہ ہی فائدہ نقصان کچھ نہیں
ایسا تو کاروبار مری جان کچھ نہیں

محمد ولی اللہ قادری کی ریڈنگ یہ بتاتی ہے کہ بدؔر محمدی کی غزلیات میں سادگی اور آمد کی جھلک ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات میں ندرت اور ترکیبوں میں ایک خوبصورت نظام سخن ملتا ہے۔ شاعر نے اپنی شاعری کو صنائع وبدائع سے بھی مزین کیا ہے۔ اخیر میں فوزیہ تبسم کہتی ہیں کہ بدؔر محمدی نے اپنی غزلوں سے ایک عام انسان کے جذبات واحساسات کو

بیدار کرنے کا کام لیا ہے۔ان کی غزلیں دلوں کو چھو لینے والی غزلیں ہیں۔ان کا یہ شعر دیکھئے ۔

بدؔر کے شعروں میں ہے عکس چمن
خار ہے گل ہے اور بوٹا ہے

مذکورہ تاثراتی بیان کے علاوہ پیش نظر کتاب کے اندرونی فلیپ پر بھی چند آراء درج ہیں جن میں بابا سائیں پروفیسر شکیل الرحمٰن کو اولیت حاصل ہے اور جناب کمال جعفری کی رائے بھی مناسب ہے۔نثری تاثرات کے علاوہ اس کتاب پر منظوم تاثرات پیش کرنے والوں میں بھی کئی نام ہیں۔ پہلا نام ظفؔر صدیقی صاحب کا ہے جنہوں نے ''خراج تحسین'' کی صورت میں پانچ قطعات کے توسط سے بدؔر محمدی کی خاصی پزیرائی کی ہے۔محمد منظر الحق منظر صدیقی نے ''غزل'' کی صورت میں بارہ مصرعوں کا سہارا لے کر ''فنون'' کو قافیہ اور ''رشتہ'' کو ردیف بنا کر کتاب اور صاحب کتاب کی خاطر خواہ توصیف کی ہے۔ڈاکٹر مظفر عالم ضیاؔ عظیم آبادی نے اپنے دو قطعات میں بدر کے مہہ کامل ہونے کی تمنا کی ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق اور ندؔا عارفی نے بدؔر محمدی کی نذر ایک ایک تہنیتی قطعہ رقم کیا ہے۔ٹھیک اسی کے بعد صفحہ نمبر ۱۶۱ سے بدؔر محمدی کی شاعری شروع ہوتی ہے جو صفحہ نمبر ۲۷۵ پر اختتام پزیر ہوتی ہے۔سب سے پہلے نصف درجن اشعار پر مشتمل ''حمد باری تعالیٰ'' ہے اس کے بعد ''نعت شریف'' ہے اس میں بھی اتفاق سے اتنے ہی اشعار ہیں۔غزلیات کا سلسلہ صفحہ نمبر ۱۶۵ سے شروع ہوتا ہے۔

اس کتاب میں بدؔر محمدی کی ایک سو دس غزلیں ہیں۔ہر غزل میں مطلع و مقطع سمیت چھ اشعار ہیں۔ان غزلوں کے مطالعہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک سو دس غزلوں کے چھ سو ساٹھ اشعار میں کچھ اشعار ایسے ہیں جو شرعی گرفت میں آ بھی سکتے اور نہیں بھی آسکتے ہیں۔ ان کی پہلی غزل کا پہلا شعر دیکھا جائے گرچہ یہ شعر غزل کا نہیں حمد کا ہے ۔

سب کچھ اُس کی عطا میں لکھتا ہوں
بس خدا کو خدا میں لکھتا ہوں

بس کا مطلب بس ہوتا ہے جب کہ خدا کی تعریف میں جتنا بھی لکھا جائے وہ کم ہوگا۔''بس'' یہاں پر مناسب لفظ معلوم نہیں ہوتا ہے،اس کا مطلب یہاں یہ ہوتا ہے کہ میں خدا کو خدا سے زیادہ اور کچھ نہیں لکھتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کو خدا بالکل نہیں لکھتا ہوں۔شروع کی پانچ غزلوں کا آغاز حمدیہ مطلع سے ہوتا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۷۳ کی غزل کا مطلع دیکھا جائے ۔

دل نوازی ہے بے رخی تیری
ہے یہی شانِ دل بری تیری

میرے خیال سے دلنوازی، دلنوازی ہوتی ہے بے رخی نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ دلنوازی تو اچھی بات ہے اسے محبوب کا تحفہ سمجھنا چاہیے۔اس کتاب کی تیرہویں غزل کے مقطع سے شاعر نے اپنی کتاب کا نام اخذ کیا ہے، مقطع کچھ یوں ہے ۔

ابن افکار بدؔر ہر شاعر
چاہے بنت فنون کا رشتہ

غزل کا یہ مطلع بھی حمدیہ مطلع کہا جاسکتا ہے جو صفحہ نمبر ۱۷۹ پر درج ہے ۔

میرے کاندھے پہ ہاتھ ہے اس کا
کتنا مضبوط ساتھ ہے اس کا

مجھے امید ہے کہ شاعرانہ پھلجھڑی سے آپ بھی واقف ہوں گے، پیش ہے اس کا ایک نمونہ ۔

گم ترے پاس میں ہو جاؤں اندھیرا کردے
زلف کا سایہ ذرا اور گھنیرا کر دے

اس میں بہت ساری غزلیں ایسی ہیں جن کا سنجیدگی سے دور کا بھی رشتہ نہیں، ہاں بنت فنون کا رشتہ ضرور ہے۔بدؔر محمدی کی غزل کا یہ مطلع اچھا لگا۔آپ بھی محظوظ ہوں ۔

بے قراری سے ہے قرار کی جنگ
آ کہ ہو ختم انتظار کی جنگ

صفحہ نمبر ۱۸۹ کی غزل کے اس مطلع سے میں متفق نہیں ہوں کیوں کہ راحت کسے پسند نہیں ہے ۔

مجھ کو دوائے درد کی حاجت بری لگی
میں بے قرار عشق تھا راحت بری لگی

ایک اور مطلع دیکھیں ۔

ایسا رشتہ کسی سے ٹوٹا ہے
سارا سنسار جیسے جھوٹا ہے

درج بالا مطلع میں ''جھوٹا'' کی بجائے ''چھوٹا'' ہونا چاہئے تھا کیوں کہ اوپر میں ٹوٹا ہے۔ اس قسم کی شاعری تک بندی تو ہوتی ہے، شاعری نہیں ہوتی۔ یہ کمی میرے اندر بھی ہے بلکہ دوسروں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ بہرحال ایک مثال اور دیکھیں ۔

ایک سا ہوں میں اندر باہر
لوگ مجھے کہتے ہیں سخنور

اس طرح کا مطلع دولخت کہلاتا ہے۔ پہلا مصرع کچھ کہتا ہے اور دوسرا کچھ اور بات کہتا ہے۔ بدرؔ محمدی کی غزل کا ایک اور مطلع دیکھا جائے جو صفحہ ۱۹۸ پر رقم ہے، وہ کہتے ہیں ۔

کیا میں نے جو ہاتھ میں اپنے تن کو
چرا لے گئے لوگ میرے چلن کو

عام طور سے تن کے ساتھ من کا استعمال ہوتا ہے، لیکن ''من'' یہاں وزن میں کم ہو جائے گا، البتہ اس طرح کہہ سکتے ہیں ع

چرالے گیا کوئی اُف میرے من کو

اب ایک اور عجوبہ مطلع ملاحظہ کیجئے۔ اس میں شاعر کسی کو کاندھے پر بٹھانے کی بات کر رہا ہے ۔

پاؤں سے اپنا ہی دوستانہ سہی
اور کے کام کا میرا شانہ سہی

بدرؔ محمدی صاحب کا دو مختلف مطلع مزید حاضر خدمت ہے ۔

مسلسل خود اپنی وکالت میں رہنا
یہ جینا ہے جیسے عدالت میں رہنا

حیران میری عقل ہے اس کے دماغ پر
پروانہ کود جائے جو بجھتے چراغ پر

پہلے مطلع کے دوسرے مصرع میں لفظ ''عدالت'' مطلق استعمال نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اگر وہ اس طرح ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا ع

یہ جینا ہے غم کی عدالت میں رہنا

دوسرے مطلع کے دوسرے مصرع میں پروانے کے کودنے کی بات نہایت بھونڈی ترکیب ہے کیوں کہ پروانہ چراغ کے گرد مسلسل پرواز کرتا رہتا ہے جب وہ تھک جاتا ہے یا جھلس جاتا ہے تو گر جاتا ہے، پھر درج ذیل مطلع دیکھئے۔ اس مطلع کے مصرع اولیٰ میں کوئی کی بجائے کسی ہونا چاہئے تھا ۔

غم کا تعویذ کوئی آہ و بکا کا تعویذ
آپ کی چشم کرم ساری بلا کا تعویذ

اگر پہلا مصرع ایسے ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا ع

غم کا تعویز کسی آہ و بکا کا تعویذ

البتہ درج ذیل مطلع شاعر کا ایک آفاقی مطلع کہا جا سکتا ہے ۔

ہو فائدہ ہی فائدہ نقصان کچھ نہیں
ایسا تو کاروبار مری جان کچھ نہیں

یہاں کچھ نہیں سے مراد کوئی نہیں ہے۔ ''ایسا تو کاروبار مرے بھائی کچھ نہیں'' ہوسکتا تھا ۔

زمیں سے دور کہیں روزگار کرتے ہیں
چلو ستارے فلک کے شمار کرتے ہیں

درج بالا مطلع میں صرف چند الفاظ کو کھپانے کا کام کیا گیا ہے ورنہ کام کی کوئی بات اس میں نہیں ہے۔ اچھا مطلع واقعی اچھا مطلع ہوتا ہے اور اچھا شعر واقعی اچھا شعر ہوتا ہے۔ ایک اچھا مطلع دیکھا جائے ۔

کارِ زیاں میں ڈھونڈ کوئی پہلو سود کا
اب توڑ دے طلسم حصارِ جمود کا

ہر تخلیق کی تنقید کا دَر تخلیق کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی کھلتا ہے۔ پیش نظر کتاب کا ایک شعر دیکھیں ۔

چیخنا میرا ہے زندوں کی طرح
کس لئے چپ آپ کی بے جان ہے

درج بالا شعر کا اولیٰ مصرع یوں ہونا چاہئے تھا:

''کس لئے چپ آپ کی یہ جان ہے۔''

ممکن ہے یہاں محض کمپوزنگ کے ستم سے ''یہ''، ''بے'' میں بدل گیا ہو یا کچھ دوسرے مقامات پر بھی کمپوزنگ نے کچھ اسی طرح اپنا کرشمہ دکھایا ہو، لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حالیہ برسوں میں کمپوزنگ کی غلطیاں

بڑھ رہی ہیں اور قرار واقعی تصحیح کے ثبوت وشواہد گھٹ رہے ہیں اور زیرنظر کتاب بھی بہر حال اس گھٹتے بڑھتے منظر نامہ کا برائے نام ہی سہی، مگر کچھ نہ کچھ شکار ضرور ہوئی ہے۔

دوسرے شاعروں کی طرح بدؔر محمدی کے یہاں بھی نعتیہ، حمدیہ، نظمیہ، غزلیہ، طنزیہ، مزاحیہ نیز استعجابیہ واستفہامیہ اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ خوبی بھی شاعر اور شاعری کی کامیابی کی منھ بولتی دلیل ہے۔ بدؔر محمدی کا ایک مقطع دیکھیں جو صفحہ نمبر ۲۱۵ پر درج ہے، وہ مقطع میں کہتے ہیں ؎

آ گیا بدؔر کو شعر کہنے کا فن
فکر اس کی مدد گار ہے ان دنوں

فن الگ چیز ہے اور فکر الگ چیز ہے۔ فکر فن سے بیگانہ ہوتی ہے اور فن فکر سے بیگانہ ہوتا ہے۔ فکر گاڑی ہے اور فن راستہ ہے۔ آگے راستہ کیسا ہوگا، گاڑی کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے، وہ تو بس چلنا جانتی ہے۔

بدؔر محمدی کی اس کتاب کا سبز اور حنائی رنگ نگاہوں کو فرحت بخشتا ہے۔ کتاب کا کاغذ دبیز اور وزن دار ہے۔ کتاب کا ہر صفحہ اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ مرحوم صباؔ نقوی کی نظم بہ عنوان ''میں ہوں بنت فنون کا رشتہ'' کے ۳۵ مصرعوں میں جو پس ورق پر درج ہے وہ تمام تہنیتی نکات پیش کر دیے ہیں جو ایک مربی کو کرنا چاہئے۔ دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی قوی امید ہے کہ بدؔر محمدی کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی دنیائے اردو ادب میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

نام کتاب	:	ذکر حیات: حضرت صوفی ابو معالم خان
مصنف	:	محمد شکیل استھانوی
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۲ء
صفحات	:	۱۸۸ قیمت : ۲۵۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ

انسانی زندگی فطرتاً ہمیشہ ہی خیر وفلاح کے راستے کی متلاشی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے لے کر آج تک ہر زمانے، ہر علاقے اور ہر زبان میں صوفیائے عظام کی سیرت وسوانح لکھنے کا رواج رہا ہے۔ خصوصاً ہندوستان میں بزرگانِ دین کی زندگی پر اردو تصنیفات وتالیفات کا ایک عظیم وقدیم سلسلہ ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کا تازہ ثبوت پیش نظر کتاب ''ذکر حیات'' ہے، جسے جناب محمد شکیل استھانوی نے لکھا ہے۔

شکیل استھانوی اپنی طالب علمی کے زمانے سے اخبارات و رسائل میں چھپ رہے ہیں۔ اب تک ان کی چھ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور لگ بھگ اتنی ہی کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔ موصوف ایک ادیب، ایک مصنف، ایک سوانح نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ پیش نظر کتاب ''ذکر حیات'' ان کی تازہ تصنیف ہے جو دراصل حضرت صوفی ابو معالم خاںؒ کی شخصیت، حیات اور ان کے کارناموں سے متعلق ہے۔ حضرت صوفی ابو معالم کی شخصیت ایک عارف باللہ اور مستند پیر طریقت کے طور پر ملک و بیرون ملک میں اپنی خاص شہرت رکھتی ہے۔ جناب محمد شکیل ان کے بے پناہ عقیدت مند ہیں۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قارئین کے سامنے لے آئیں اور یقیناً اپنی اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں۔

موصوف نے اپنی اس کتاب کا انتساب اپنے والد بزرگوار مرحوم اور والدہ محترمہ کے ساتھ ساتھ چھوٹے ابا مرحوم اور نسبتی بھائی مرحوم کے نام کیا ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں محترم ناوکؔ حمزہ پوری، پروفیسر محسن عثمانی، ڈاکٹر ریحان غنی، جناب راشد احمد اور جناب زبیر احمد بھاگلپوری جیسے دانشور حضرات نے کتاب اور صاحب کتاب کے متعلق بیش قیمتی رائیں پیش کی ہیں۔ ناوکؔ حمزہ پوری لکھتے ہیں کہ:

> ''شکیل استھانوی کی ذات کی برکات مجھے بڑی غنیمت لگی۔ موصوف نے جیسی صاف ستھری اور بے عیب زبان استعمال کی ہے، یونیورسٹیوں کی حد تک بیشتر استاد ان زبان وادب ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔''

پروفیسر محسن عثمانی نے لکھا ہے کہ:

> ''کسی بھی کتاب کو پڑھنے کے لیے جو جمعیت خاطر ہونی چاہئے، وہ میسر نہ تھی، لیکن بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو

خود اپنے کو پڑھوالیتی ہیں۔ چنانچہ رات کو فرصت ملی اور
کتاب کا مسودہ اپنے ہاتھ میں لیا تو پوری کتاب پڑھ گیا۔''
ڈاکٹر ریحان غنی فرماتے ہیں کہ:

''تصوف سے مولانا محمد شکیل استھانوی کا گہرا تعلق ہے
وہ صحافت سے بھی شغف رکھتے ہیں۔''

پیش نظر کتاب ''ذکر حیات: حضرت صوفی ابو معالم خاں'' کے نام سے ہی واضح ہے یہ کتاب حضرت والا مرتب علیہ الرحمتہ کی سوانح، معاملات سلوک، اخلاق عالیہ، ان کی زندگی کے معمولات، ان کے عادات واطوار، ان کے کردار وعمل اوران کے کشف وکرامات پر مبنی ہے۔

شکیل استھانوی نے اس کتاب میں اپنے پیر طریقت کے بارے میں بہت وثوق کے ساتھ وہ تمام باتیں لکھی ہیں جن کا مشاہدہ انہوں نے بہت قریب سے کیا ہے۔ مقدمہ کتاب کے بعد حضرت الحاج الحافظ صوفی ابو معالم خان علیہ الرحمتہ کا مختصر سوانحی خاکہ تین صفحوں پر مشتمل ہے جس میں ان کے والدین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت صوفی صاحب کہاں پیدا ہوئے، انہوں نے کہاں تعلیم حاصل کی، شادی کہاں ہوئی، اولادیں کتنی ہوئیں، ان کے معمولات کیا تھے، وہ لوگوں میں کیوں اور کس قدر مقبول ومشہور تھے، وہ کشف وکرامات کی وجہ سے لوگوں کے درمیان کس قدر ہردلعزیز تھے۔ سگ گزیدہ مریض کی انجکشن کے بغیر صحت یابی، گم شدہ سامان کی

آسانی سے بازیابی، شرابی کا نمازی بن جانا، برسوں سے گم شدہ لڑکے کا واپس آجانا، ایک بڑے عہدہ دار کو اُس کی گستاخی اور اس کے گھمنڈ کی سزا ملنا، ایک خبیث کو بھاگ جانے پر مجبور ہونا وغیرہ ایسے متعدد واقعات ہیں جن سے حضرت ابوالمعالم کی کرامتیں سامنے آتی ہیں، ان میں سے یہاں ایک دو واقعہ کا ذکر کرنا مناسب لگتا ہے۔ صلاح الدین نام کے ایک آدمی اپنی زندگی میں نشیب وفراز سے گزر رہے تھے۔ کئی طرح کی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں:

''حضرت پیر صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
میری پریشانیوں کو دور فرمایا اور مجھے آرام وسکون کی
زندگی نصیب فرمائی اور آج ہمارے پاس اللہ رب العزت
کی عطا کردہ ساری چیزیں موجود ہیں۔'' (ذکر حیات ص ۶۶)

اکثر وبیشتر بہت سے لوگوں سے یہ باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ فلاں کو ''جن'' نے پریشان کر رکھا ہے یا فلاں کے گھر میں ''جن'' ہے یا اس جگہ یا اس گھر میں ''جنات'' کا بسیرا ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حافظ مسعود عالم نے بھی اپنے تعلق سے لکھا ہے کہ وہ ''جن'' کی وجہ سے پریشان تھے۔ حضرت صوفی ابو معالم خان صاحبؒ سے انہوں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو حضرت صوفی صاحب نے حافظ مسعود صاحب سے فرمایا کہ ''جنات'' سے جا کر کہنا کہ وہ اپنا راستہ بدل دے۔ حافظ صاحب نے حکم کی تعمیل کی اور پھر ان کی ساری پریشانی دور ہوگئی۔

شکیل استھانوی اس کتاب کے ''مقدمہ'' میں حضرت صوفی صاحب سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''حضرت صوفی صاحب میرے پیر بھائی تھے۔ حضرت
صوفی صاحب سن و سال میں کافی فرق ہونے کے
باوجود مجھے 'شکیل بھائی' ہی کہتے تھے لیکن میں آپ کو آپ
کے مقام ومرتبہ کے مطابق اور عقیدت ومحبت کے ساتھ
'حضرت' ہی کہتا تھا۔ حضرت صوفی صاحب نے جس
طرح اس حقیر کی عزت کی اور جس قدر مجھ ناچیز کو عزیز
رکھا میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔''

(ذکر حیات، ص ۲۵)

حضرت صوفی ابو معالم خاں صاحبؒ کی پیدائش موضع بخش پور، ضلع اعظم گڑھ میں ۱۹۴۹ء میں ہوئی اور ۲۰۱۲ء میں آپ نے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ آپ اپنے وقت کے بلند پایہ بزرگ اور مستجاب الدعوات شیخ کامل تھے۔ آپ مدرسہ فیض العلوم، ٹھکماں، اعظم گڑھ کے ناظم اعلیٰ اور اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالحکیم خان صاحب کے جانشیں اورانہیں کے خلیفہ بھی تھے۔

حضرت صوفی ابومعالم اللہ کے ولی تھے اور پوری زندگی حکم خداوندی کے مطابق سنت رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے گزاری۔ بزرگوں کی تربیت اور ان کی توجہ کا عکس حضرت صوفی ابومعالم صاحب کی مجلسوں میں بھی نظر آتا تھا جس کا ذکر مصنف نے بعض افراد کے ذاتی مشاہدات کے حوالے سے اس کتاب میں کیا ہے۔

زیرنظر کتاب کے بیانات کی روشنی میں بعض مقامات پر حضرت ابومعالم علیہ الرحمتہ کی روشن خیالی بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے، مثلاً جب آپ لڑکوں کو تعلیم یافتہ بنانے پر زور دیتے ہیں اور دینی علوم کے ساتھ عصری و سائنسی علوم کے حصول کی بھی ترغیب دیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دین وتصوف کے نام پر ترک دنیا کے قائل نہ تھے، بلکہ زمانہ شناسی کی جدوجہد اور تدبیر بھی ضروری سمجھتے تھے۔

زیرنظر کتاب کے آخری اوراق میں حضرت صوفی ابومعالم صاحب کے سلسلہ عالیہ کا تفصیلی تعارف، آپ کے شجرہ طریقت کی تفصیلات اور آپ کے ممتاز خلفاء کا تذکرہ ان کی سیرت وسوانح کے ساتھ ہوا ہے۔ یہاں خود حضرت صوفی صاحب کی سیرت وسوانح کی بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

اس کتاب میں شکیل استھانوی نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ حضرت موصوف کی زندگی کا کوئی پہلو بھی تشنہ نہ رہے اور یہ بھی کہ عقیدتوں کا اظہار ہو، مگر اس میں غلو کی کیفیت نہ آئے، بلکہ مشاہدات و تجربات کے حوالے سے بدیہی حقیقت کے جلوے منعکس ہوتے رہیں۔ مصنف کی یہ پیش کش بایں لحاظ بیش قیمت قرار دی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی قاری اس کے مطالعے کے بعد دین وشریعت اور رشد وہدایت کی جانب راغب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی مذکورہ کتاب خصوصاً نئی نسل کے لیے یقینی طور پر راہ ہدایت کا در وا کرے گی۔

آج کے صارفیت پسند دور میں، جب کہ ہر شخص مطلب پرستی اور خود غرضی کا شکار ہے، مصنف موصوف کی مخلصانہ کاوش اس بات کی غماز ہے کہ ان کے دل میں نہ صرف تصوف اور راہ سلوک کے لیے بے پناہ عقیدت ہے بلکہ دین وشریعت اور اس کی اشاعت کے لیے بھی ان کا سینہ جذبہ صدق وصفا کا مدینہ ہے۔

نام کتاب	:	عطاؔ عابدی اور ادب اطفال			
مرتب	:	ڈاکٹر منور راہی			
ناشر	:	دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، دربھنگہ			
اشاعت	:	۲۰۲۳ء			
صفحات	:	۳۳۶	قیمت	:	۴۰۰روپے
مبصر	:	**ایم. احمد توصیف**			

زندگی وزمانہ اور خصوصاً علم وادب کے میدان میں نمایاں کام کرنے والوں کی قدر افزائی ہمیشہ ہی باشعور اور سنجیدہ وبلند نظر معاشرے کا شعار رہا ہے۔ اس کا ایک تازہ ثبوت پیش نظر کتاب ''عطا عابدی اور ادب اطفال'' ہے جسے ڈاکٹر منور راہی نے ترتیب دیا ہے۔ جناب راہی درس وتدریس کے شعبہ سے منسلک ہیں اور دینی، علمی وادبی اور سماجی سرگرمیوں سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کی تحقیقی کتاب ''ہندوستانی فلموں سے اردو کا رشتہ'' کے علاوہ اُن کا شعری مجموعہ ''لہولہو ہے قدم'' بھی اشاعت پاچکا ہے اور اب اُن کی زیرنظر مرتبہ کتاب منظر عام پر آئی ہے جو اصلاً چالیس قلم کاروں کی سینتالیس تحریروں کا ایک وقیع مجموعہ ہے اور عطا عابدی اور ان کی تحریریں مذکورہ اعداد وشمار پر ایک اور اضافہ کے مصداق ہیں۔ یہاں جن قلم کاروں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے اُن میں علاقائی اعتبار سے صرف بہار ہی نہیں بلکہ بیرون بہار اُڑیسہ، اترپردیش، بنگال، مہاراشٹر اور تلنگانہ کے مشاہیر قلم بھی ہیں اور متنوع علمی وادبی طبقات کے لحاظ سے علما وشعرا، صحافی اور معروف نثر نگار بھی، پھر یہاں خواتین اور غیر مسلم قلم کاروں کی شمولیت کا خانہ بھی خالی نہیں ہے۔

اس کتاب کا ''انتساب'' پوری معنوی برجستگی کے ساتھ ''مستقبل کے معمار قوم وملت کے نونہالوں کے نام'' ہے اور ''عطا عابدی اور ادب اطفال: ایک مطالعہ'' کے عنوان سے اس کتاب کا ''پیش لفظ'' خود ڈاکٹر منور راہی نے لکھا ہے جو مذکورہ تالیف کے صفحہ ۶ سے صفحہ ۴۲ تک پہنچتا ہے۔ اس میں ابتدأ حیات وحالات، تعلیم، ملازمت، صحافت، تنظیم وتحریک، اعزازات وانعامات، تحقیق اور التفات واعتراف کے ضمنی عنوانات قائم کرکے عطا عابدی کے سوانحی گوشے سامنے لائے گئے ہیں

اُس کے بعد عطا عابدی کی شخصیت، علمی کارنامے اور خصوصاً ادبِ اطفال کے تعلق سے اُن کی کتابوں کا تذکرہ ہوا ہے اور آخر میں اس کتاب کے مشمولہ مواد پر ضروری اور سیر حاصل وضاحتی وتعارفی باتیں کی گئی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''پیش لفظ'' اور اوراقِ تصاویر کے درمیان ''ابواب'' کی ہفت اقلیم میں منقسم ہے۔ پہلے اور دوسرے باب میں عطا عابدی کی خدمات کو اُن کی تخلیقی کاوشوں کے حوالہ سے، تیسرے باب میں تحقیقی کاوش کے حوالے سے، چوتھے باب میں قندِ مکرر یا عطر مزید کے طور پر شذراتی واقتباساتی سطروں کے حوالے سے اور اس کے بعد پانچویں، چھٹے اور ساتویں باب میں خود عطا عابدی کی منتخب کہانیوں اور نظموں کے حوالے سے سامنے لایا گیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب صفحہ ۴۳ سے صفحہ ۱۰۷ تک پھیلا ہوا ہے، جس میں ''مناظرے مذکرومؤنث کے'' پر مضامین، تبصرے اور تاثرات کی صورت میں گیارہ قلم کاروں کی تحریریں شامل ہیں جن میں بحیثیت مجموعی عطا عابدی کی مذکورہ کتاب کو ادب اطفال کی نمائندہ کہانیوں کا مجموعہ اور اس نوع ادب میں ایک خوبصورت اضافہ قرار دیتے ہوئے اور ''مناظرے......'' کی بعض کہانیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں موضوعاتی تنوع اور اصلاحی فکر وخیال کے ساتھ بچوں کے لئے ہمدردی وفکرمندی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ کہانیاں صرف دلچسپ، معلوماتی اور سبق آموز ہی نہیں بلکہ ان میں عام فہم اور سہل وسادہ اندازِ تخاطب بھی ملتا ہے۔ یہاں زبان کا انتخاب بچوں کی عقل اور ان کا ذہن سامنے رکھتے ہوئے ہوا ہے، اس لئے یہ کہانیاں بچوں کی ذہن سازی میں سرتاسر معاون ہیں۔

دوسرے باب کی شروعات صفحہ ۱۰۸ سے ہوتی ہے اور صفحہ ۱۶۰ تک پہنچتی ہے۔ یہ باب مضامین، تبصرے اور تاثرات پر مشتمل چھ قلم کاروں کی تحریروں سے شادوآباد ہے، جن میں عطا عابدی کی کتاب ''خوشبو خوشبو نظمیں اپنی'' پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اس مجموعہ کی نظموں کے سیر حاصل تجزیے کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ اپنی ہمہ طور افادیت اور بچوں کے ذہن کی نشوونما اور ان کے تابناک مستقبل کے لئے یہ ایک معتبر مجموعہ کہلا سکتا ہے۔ اس کتاب کی نظموں میں لطیف الفاظ اور مترنم بحروں کا استعمال ہوا ہے اور اپنے مذہبی، پیامی اور تربیتی رنگ وآہنگ کے لحاظ سے یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ بچوں کے لئے اسے ابتدائی درجات کے نصاب میں جگہ دی جائے۔

اس کتاب کا تیسرا باب صفحہ ۱۶۱ سے ص ۲۵۴ تک دراز ہے، جس میں ''بچوں کی کتابیں: تعارف وتذکرہ'' پر ۱۸ قلم کاروں کی تحریروں سے قاری کی ضیافت ہوتی ہے۔ یہ تحریریں مضامین کی شکل میں بھی ہیں اور تبصرے و تاثر کی شکل میں بھی۔ عطا عابدی کی اس کتاب پر جدول بہ جدول نظر ڈالتے ہوئے یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اِس کارآمد، دلچسپ اور منفرد کتاب کی اہمیت وافادیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کتاب کو اپنے موضوع پر تعارف وتذکرے کے حوالے سے قدیم وجدید کا سنگم اور تحریک دلانے والی کتاب قرار دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس حوالہ جاتی کتاب میں مصنف نے بچوں کے قلم کاروں کی ایک کہکشاں سجادی ہے۔ یہ نئی فکری جہات کی نمائندہ اور نصاب سازوں کو ادب اطفال کی طرف متوجہ کرنے والی کتاب ہے۔ اس میں اہم انکشافی پہلو بھی ہے، بہار میں ادب اطفال پر کام کرنے والوں کے لئے رہنمائی کا سامان بھی اور کتب اطفال کی قدر شناسی کے ثبوت وشواہد بھی۔ تحقیقی لحاظ سے انفرادیت اور صحت کا وصف رکھنے والی یہ کتاب اپنے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا کہلانے کی حقدار ہے۔ یہاں بعض دیگر نکات کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں مواد کی یکجائی بہت ہی عرق ریزی سے ہوئی ہے اور قلم کاروں کا ذکر نہایت جامع انداز سے ہوا ہے۔ یہ کتاب اشاریہ سازی میں بھی خصوصی طور سے معاون ہے، اس میں ادب اطفال کی تاریخ رقم کرنے والوں کے کارنامے کا اعتراف بھی ہے اور اُن لوگوں کے لئے دندان شکن جواب بھی جو ادب اطفال کو دوسرے درجہ کا ادب بتاتے ہیں۔

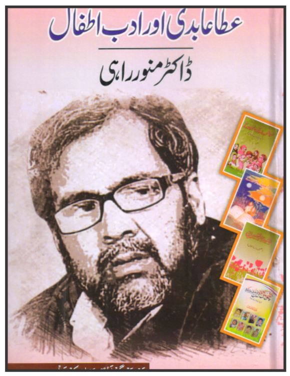

ڈاکٹر منور راہی کی اس مرتبہ کتاب کا چوتھا باب ''شذرات/

اقتباسات'' صفحہ ۲۵۵ سے صفحہ ۲۶۷ تک محیط اور ۱۲ قلم کاروں کی تحریروں پر محتوی ہے، اس باب میں کچھ ''مکتوبات'' بھی ہیں اور یہاں جو کچھ اظہار خیال ہوا ہے اس سے خلاصہ طور پر یہ بات مترشح ہو جاتی ہے کہ ادب اطفال کے حوالہ سے عطا عابدی کی کتابوں میں ناصحانہ اور تربیتی انداز ملتا ہے، ان کی کاوشیں دستاویزی نوعیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے بہار کے حوالے سے صبر آزما تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کے یہاں نہ صرف مختصر تجزیاتی اشارے ہیں بلکہ موضوعات کا انفرادی تجربہ اور ادب اطفال کو کمتر سمجھنے والوں کی ذہنیت کا کامیاب منطقی تجزیہ بھی ہے۔

زیر نظر کتاب کا پانچوں باب صفحہ ۲۶۸ سے صفحہ ۲۸۷ تک پھیلا ہوا ہے جس میں ''مناظرے.....'' کی چار کہانیاں بصورت انتخاب شامل ہوئی ہیں یعنی ''فیصلہ''، ''اختر کی پنسل''، ''تسلیمن چاچا'' اور ٹائٹل کہانی ''مناظرے مذکر اور مؤنث کے'' بعد ازیں صفحہ ۲۸۸ سے صفحہ ۳۱۵ تک پھیلے ہوئے چھٹے باب میں ''خوشبو خوشبو نظمیں اپنی'' سے ۱۶ نظمیں بطور انتخاب شامل کی گئی ہیں، پھر صفحہ ۳۱۶ سے کتاب کے آخری متنی صفحہ ۳۳۲ تک ''ساتویں اور آخری باب میں رسائل سے ماخوذ عطا عابدی کی دس نظمیں دی گئی ہیں جن میں بچوں کے تین ہائیکو بھی ہیں۔ صفحہ ۳۳۳ سے صفحہ ۳۳۶ تک ''تصاویر'' کا حصہ ہے جس میں مشمولہ ۹ تصاویر سے کتاب کے مرتب ڈاکٹر منور راہی کی علمی وادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں آخری نویں تصویر میں جناب راہی اور عابدی کو ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

پیش نظر کتاب یقیناً محنت وخلوص سے علمی آداب کے ساتھ مرتب کی گئی ہے اور نئے موضوع کے اثبات میں بہرحال کامیاب ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے اس میں شامل سبھی قلم کاروں کو نام بنام یاد کیا جاتا، لیکن کچھ طوالت کے خوف سے اور کچھ ناموں کے انتخاب میں اپنی کم نظری کے احساس سے ایسا نہیں ہو سکا ہے اور اس سے بڑھ کر اس خیال سے بھی کہ یہاں قلم کاروں کے اسمائے گرامی ذکر میں آئیں یا نہ آئیں بہرحال ان کی تعداد ''عطا عابدی اور ادب اطفال'' کے لاینفک رشتہ کو خبر متواتر کے حکم میں لے ہی آتی ہے۔

امید قوی ہے کہ اہل ذوق اس تالیف کو پسند کریں گے اور اسے خرید کر اپنی ذاتی لائبریری میں رکھنا بھی چاہیں گے۔ ❁❁

شاعر کے لئے استعارے کی ضرورت اور اہمیت

ارسطو کے وقت سے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ شعر کی جان استعارہ ہے۔ شاعر بقول شیکسپیئر اپنے تخیل کی مدد سے پرچھائیوں کو جسم اور محسوسات کو زبان دیتا ہے، عام زبان کی توسیع کرتا ہے اور ہر لفظ کو گنجینہ معنی کا طلسم بنا دیتا ہے۔ عبدالرحمٰن نے ''مرأۃ الشعرا'' میں لکھا ہے کہ ''شعر میں اصل حقیقت مجاز ہے۔ مجاز میں جو صنعت گری کی جاتی ہے اُسے تشبیہ اور استعارے کے نام سے پکارتے ہیں، لیکن تشبیہ ہو یا استعارہ، دل پذیر ہو تو صنعت گری ہے، ورنہ خیرہ سری ہے۔ جہاں تشبیہ واستعارے کے معانی کا معلوم سے غیر معلوم کی طرف جانا مطلوب ہے وہاں تشبیہ واستعارے کا استعمال مرغوب ہے۔'' شاعر کو جب اپنے خیال کے اظہار کے لئے مناسب اور موزوں الفاظ نہیں ملتے تو اسے کلمات والفاظ کا سینہ چیر کر اس میں نئے معانی کی روح داخل کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح علائم ورموز تشبیہات و استعارات وجود میں آتے ہیں۔ جب الفاظ اپنے معانی غیر حقیقی یا معانی غیر لغوی یا معانی مجازی میں استعمال کئے جاتے ہیں اور معانی لغوی اور معانی مجازی میں رشتہ تشبیہ کا ہوتا ہے تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ بغیر تشبیہ کے یہ رشتہ مجاز مرسل کا ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے۔ غالبؔ کے خیالات کے اظہار کے لئے شعر کی مروجہ زبان ناکافی تھی، تب انہیں ایک معنی میں اپنی زبان خود بنانی پڑی۔ انہوں نے ترکیبوں، استعاروں اور تشبیہوں کی مدد سے یہ نئی زبان بنائی۔ اقبالؔ بھی غالبؔ کے قبیلے کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں جو ''بکھرے خیالات'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، لکھا تھا کہ ''سائنس، فلسفہ، مذہب سب کے حدود ہیں صرف فن ہی لامحدود ہے۔'' جب بھی شاعر کے خیالات دقیق ولطیف ہوں گے، واردات پیچیدہ ہوں گی، کوائف پراسرار ہوں گے تو فنکار کوشش کرے گا کہ مجاز سے کام لے کر، تشبیہ اور استعارے برت کر لطیف کیفیات و واردات کے وہ پہلو اور وہ حالتیں سننے اور پڑھنے والے تک پہنچا دے جن کے اظہار کا کوئی اور طریقہ نظر نہ آتا ہو۔ (آل احمد سرور کے ریڈیائی مقالہ مطبوعہ ''آواز'' ج ۲ ش ۲۴ ص ۴ سے ماخوذ)

وفیات

شارؔب ردولوی چل بسے

گزشتہ دنوں ۱۸/اکتوبر۲۰۲۳ءکوترقی پسند تحریک کے مضبوط ستون مانے جانے والے معروف نقاد وادیب، محقق اور شاعر پروفیسر شارؔب ردولوی مختصر علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انـــاللّٰہ الـخ ۔انہیں ڈینگو بخار کی تصدیق کے بعد لکھنؤ کے اپولو ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا، جہاں انہوں نے دورانِ علاج بدھ کی صبح آخری سانس لی اوراسی دن شام ۷ ربجے کر بلا عباس باغ لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

پروفیسر شارب ردولوی کا اصل نام مسیّب عباس تھا، لیکن علمی وادبی دنیا میں انہوں نے اپنے قلمی نام وتخلص سے ہی شہرت پایا۔اُن کا تعلق ضلع بارہ بنکی کے ایک زمیندار علمی گھرانے سے تھااوران کے والد مولوی حسن عباس عربی وفارسی اورعلوم مشرقیہ کے بڑے واقف کاروں میں محسوب ہوتے تھے۔ شارؔب ردولوی کی جائے پیدائش اودھ کے مردم خیز قصبہ ردولی کا محلّہ عباسی اورتاریخ پیدائش یکم ستمبر ۱۹۳۵ء ہے۔وہ اسرارالحق مجاؔز اور باقر مہدی کے ہم وطن تھے اور اُن کا شمار ترقی پسند تحریک کی پہلی نسل میں ہوتا تھا۔۱۹۵۳ء میں کانپور سے انٹرمیڈیٹ کے بعد انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اورایم اے کی سند لی اوراسی یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔انہوں نے پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا تھا جو ''جدید اردو تنقید:اصول ونظریات'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اوراردوادبی تنقید کی دنیا میں ایک اہم حوالہ جاتی تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

شارؔب ردولوی کی تصنیفات وتالیفات کی فہرست میں ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے نام شامل ہیں''اسرارالحق مجاؔز'' پر لکھے گئے مونوگراف کے علاوہ''تنقیدی مباحث''،''مرثیہ ومرثیہ نگار''،''معاصر اردو تنقید''،''انتخاب غزلیات سوؔدا مع مقدمہ''،''آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید''،''اردو مرثیہ''، ''تنقیدی مطالعہ''،''مطالعہ وؔلی''،''جگؔر:فن اور شخصیت''،''افکارسوؔدا''،''مراثی انیؔس میں ڈرامائی عناصر'' اورانتخاب غزل بنام''گل صدرنگ'' اُن کی وقیع یادگاریں ہیں۔مزید برآں اُن کی کتابوں میں''تنقیدی عمل'' اور''افسانہ وافسانہ نگار'' کے نام بھی آتے ہیں اوراُن کی آخری کتاب خودنوشت سوانح''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم'' کا ذکر بھی بعض جگہ ملتا ہے جو ۲۰۲۱ء کے آس پاس لکھی گئی ہے۔شارؔب ردولوی نظم ونثر دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔انہوں نے نہ صرف غزل،نظم،قصیدہ اور دیگر اصناف میں شاعری کی ہے بلکہ متعدد خاکے، رپورتاژ اورریڈیائی فیچرز بھی لکھا ہے جو اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

شارؔب ردولوی کی عملی زندگی کا باضابطہ آغاز ۱۹۶۱ء میں، دیال سنگھ کالج دہلی میں بحیثیت لکچرر تقرری سے ہوا، اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں ترقی اردو بیورو،نئی دہلی میں انہوں نے پبلی کیشن آفیسر کا عہدہ سنبھالا،لیکن ۱۹۷۹ء میں یہاں سے مستعفی ہوکر پھر دیال سنگھ کالج میں آگئے۔۱۹۹۰ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر اور ۱۹۹۳ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی،نئی دہلی کے سینٹر آف انڈین لینگویجز میں بحیثیت پروفیسر اُن کی تقرری ہوئی اور ۲۰۰۰ء میں وہ یہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔پروفیسر شارؔب ردولوی مذکورہ مناصب کے علاوہ''کیفی اکیڈمی'' کے تاحیات صدر،اکسپرٹ کمیٹی برائے نصاب اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی کے چیرمین، اترپردیش اردو اکادمی، بورڈ آف مینجمنٹ آف دی اکیڈمی پروفیشنل ڈیولپمنٹ اینڈ اردو میڈیم ٹیچرز جامعہ ملیہ دہلی، گورننگ کانسل غالؔب اکیڈمی، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور لکھنؤ، الٰہ آباد، کشمیر، جموں، دہلی، جے این یو کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر کی حیثیت سے بھی مسلسل اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔شارؔب ردولوی کی علمی وادبی خدمات کے سلسلے میں انہیں متعدد انعامات سے نوازا گیا، جن میں اترپردیش اردو اکادمی کا''مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ ۱۹۹۹ء'' اور دہلی اردو اکادمی کا''بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ۲۰۱۹ء''

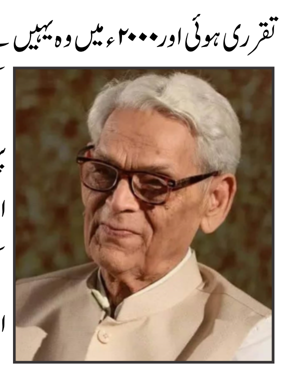

شامل ہے۔اس کے علاوہ ''غالب ایوارڈ''، ''اردو ادب ایوارڈ''، ''رودولی سمان''، ''فراق گورکھپوری ایوارڈ''، ''تنقید و تحقیق ایوارڈ''، ''نیاز فتح پوری ایوارڈ''، ''نشان سجاد ظہیر''، ''الفکر اعزاز، کراچی''، ''امتیاز میر ایوارڈ'' اور کئی دوسرے ایوارڈ بھی انہیں ملے۔شارب ردولوی کو اندرون ملک اسفار کے علاوہ کئی بیرونی ممالک کے اسفار کا موقع بھی ملا، جن میں مصر، شام، عراق، لبنان، کویت، کناڈا، امریکہ، دوبئی اور پاکستان وغیرہ شامل ہیں۔ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ شارب ردولوی تعلیمی و سماجی خدمات میں بھی نہایت فعال تھے، جس کا ایک بڑا ثبوت ''شعاعِ فاطمہ'' نامی تعلیم ادارے کا قیام ہے۔

شارب ردولوی نہ صرف خود زندگی کے آخرین ماہ و سال تک تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگے رہے، بلکہ اُن کی نصف بہتر پروفیسر شمیم نکہت بھی تا حیات علمی و تصنیفی کام کرتی رہیں۔نکہت صاحبہ ۱۹۶۵ء میں شاداب صاحب کے حبالہ عقد میں آئی تھیں اور اگر چہ ۲۱ ستمبر ۲۰۱۶ء کو وہ انہیں داغِ مفارقت دے گئیں، لیکن اُن کا تصنیفی مزاج بہر حال نمایاں رہا۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''دو آدھے'' اور مضامین کا مجموعہ ''تاثرات'' اشاعت یافتہ ہے جس کا انتساب انہوں نے بیس سال کی عمر میں جدائی کا دائمی کرب دے جانے والے شعاع فاطمہ کے نام کیا ہے۔شارب صاحب اپنی اہلیہ شمیم نکہت کی یاد میں ہر سال ادبی خطبہ کا بھی اہتمام کیا کرتے تھے۔

شارب ردولوی شخصی طور پر نہایت ملنسار اور نرم گفتار آدمی تھے اور اپنے ترقی پسند معاصر شعرا میں مجاز، سردار جعفری اور کیفی سے ذاتی مراسم رکھتے تھے۔وہ پروفیسر احتشام حسین جیسے عظیم اشترا کی تنقید نگار کے شاگرد رشید اور ترقی پسند نظریہ کے حامی ضرور تھے، لیکن انہوں نے ایک متوازن نقاد کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی اور تقریباً نصف صدی تک تدریسی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔وہ کلاسیکی اور جدید ادب پر گہری نظر رکھنے والے فن کار تھے اور اشترا کی تنقید کے حوالے سے ان کی شخصیت بقیۃ السلف کا درجہ رکھتی تھی۔

نظریاتی و عملی تنقید میں شارب ردولوی کے کارنامے بہت ہی قابل قدر اور یک گونہ اساسی نوعیت کے ہیں۔ایک طرف وہ واقعہ یادگار ہے جب کہ شارب ردولوی لکھنؤ میں بی اے کے طالب علم تھے اور پاکستان میں راولپنڈی سازش کیس کے تحت سجاد ظہیر کی گرفتاری کے بعد لکھنؤ میں اُن کی رہائی کے لئے مہم چل رہی تھی تو اس مہم کو منظم کرنے میں شارب ردولوی پیش پیش تھے اور دوسری طرف ذرا بعد کے زمانے کی وہ علمی و فکری کاوش بھی نا قابل فراموش ہے جب کہ شارب ردولوی نے ترقی پسند تنقیدی نظریات کے اصول و ضابطے بنانے کا مہم ترین تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

بیشک نازک وقتوں میں کئی جہت سے ترقی پسند تحریک کو جن شخصیات کے علم و قلم اور افکار و نظریات کی بدولت مناسب سہارا ملا، ان میں شارب ردولوی کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔یوں تو انہوں نے مختلف نثری اور منظوم اصناف میں لکھا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ ادبی تنقید کے مرد میدان تھے اور اس کے سماجیاتی دبستان سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے انہیں بجا طور پر ''موثر و باوثوق نقاد'' کہا ہے۔وہ اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ کسی فن پارے کی عظمت کا قرار واقعی تعین اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ فنی اور جمالیاتی نقطہ نظر سے بھی مکمل ہو۔وہ مغربی ناقدین کے بھاری بھرکم جملوں سے تنقید میں فنکاری دکھانے کو ایک قسم کی کرتب بازی یا کاریگری کا نام دیتے تھے اور مغرب کے افکار و خیالات سے بس خاص اور ضروری حد تک ہی استفادہ کے قائل تھے۔

شارِبؔ ردولوی کی تنقید میں دقیق الفاظ واصطلاحات سے احتراز، متوازن وشائستہ لب ولہجہ، استدلالی انداز بیان اور ادبی مسائل پر نہایت واضح رائے کی پیش کش کا وصف اور معیاری تنقید کی سادہ وسلیس اور عام فہم زبان سے کام لینے کا حتمی رجحان نمایاں ہے۔ ''نذر شاربؔ'' کے نام سے اُن پر محمد ادریس سنبھلی کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔

شاربؔ ردولوی بہت ہی وسیع المطالعہ شخصیت کے حامل تھے اور کبر سنی کے باوجود تازہ ادبی رسائل وجرائد صرف پڑھتے ہی نہیں تھے، بلکہ مجلّاتی ادبی صحافت کو اپنے تاثرات سے بھی وقتاً فوقتاً نوازتے تھے۔ اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' بھی ان کے مطالعہ سے گزرتا تھا۔ ستمبر ۲۰۲۲ء کے شمارے میں اشاعت یافتہ اُن کا خط دیکھا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے رسالہ کی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''زبان وادب'' جولائی ۲۰۲۲ء کا شمارہ ملا تھا۔ معذرت خواہ ہوں کہ فوراً آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ عمر نے سارے اعصاب کو متاثر کر رکھا ہے، اس میں ہاتھ بھی شامل ہے جس کی وجہ سے لکھنے کا کام دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا ہے۔ ''زبان وادب'' کے سلسلہ میں آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں۔ ''زبان وادب'' نے اردو رسائل میں اپنا ایک معیار قائم کیا ہے۔ رسالے کی اس انفرادیت اور بہت اچھے انتخاب کے لئے آپ کے ادارے کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اس شمارے کے کئی مضامین نے اپنی طرف متوجہ کیا جس میں سب سے زیادہ دلچسپ، علمی، ادبی اور تحقیقی مضمون شبر امام صاحب کا مقالہ ''عندلیب شادانیؔ، عطااللہ پالوی اور جگرؔ مرادآبادی'' ہے۔ جگرؔ مرادآبادی اپنے عہد کے بے حد مقبول اور محترم شاعر تھے۔ جگرؔ صاحب غنائی شاعر تھے۔ اپنی غزلوں، اپنے ترنم اور محویت میں پڑھنے کی وجہ سے ہر بڑا چھوٹا ان کا دلدادہ تھا۔ رشید احمد صدیقی جیسے صاحب نظر نے انہیں غزل کی آبرو کہا۔ عندلیب شادانیؔ ایک بڑے عالم وناقد تھے، لیکن ان کا زبان واظہار کا ایک مخصوص رویہ تھا جو بعض لوگوں کو ناگوار گزرتا تھا اور اکثر ان کی تحریر پر دوسرے اکابرین نے سوالات اٹھائے ہیں۔ ان سوال اٹھانے والوں میں عطااللہ پالوی بھی ہیں جو اپنے عہد کے بڑے عالم، محقق اور کئی زبانوں پر دسترس رکھنے والے ناقد تھے۔ شبر امام صاحب نے عندلیب شادانیؔ اور عطا اللہ پالوی کے حوالے سے جو مضمون لکھا ہے وہ بہت اہم ہے، اس لئے نہیں کہ وہ ایک بڑے اور مقبول شاعر کی زبان سے متعلق ہے بلکہ جن مثالوں اور حوالوں سے عطا اللہ پالوی نے عندلیب شادانیؔ کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، وہ مطالعہ شعر کے نئے دروازے کھولتے ہیں۔ شبر امام صاحب نے دونوں حضرات کے اعتراضات اور جوابات کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ مطالعہ جگرؔ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شبر امام صاحب کی بیشتر تصنیفات کے مطالعے کا موقع مجھے ملا ہے۔ وہ تحقیق وتنقید پر گہری نگاہ رکھتے ہیں ان کا یہ مضمون بھی زبان شعر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک تحفہ ہے۔ ماہیے کی روایت پر سید نفیس دسنوی کا مضمون بہت معلوم افزا (Informative) ہے جو تفصیلات انہوں نے ماہیے اور اس کے وجہ تسمیہ کے بارے میں تحریر فرمائی ہیں، وہ بہت اہم ہیں۔ اس شمارے میں غنی خاں عاجزؔ پر ایک اچھا مضمون پڑھنے کو ملا۔ ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ نے ان کے حالات اور کلام کو جمع کرنے میں بڑی تگ ودو کی ہے، اس طرح ایک شاعر کو انہوں نے گمنامی میں ختم ہو جانے سے بچا لیا۔ اس شمارے کے دیگر مضامین، نظمیں اور غزلیں بھی اچھی ہیں۔ شعری انتخاب کی طرف تھوڑی سی اور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔''

❁❁❁

☆ ''زبان وادب''، اکتوبر ۲۰۲۳ء نظر نواز ہوا۔ پچھلے شمارے سے ہی آپ نے اس کی ''رنگینی'' جو برسوں سے کہیں کھوئی ہوئی تھی، لوٹا لایا ہے۔ اس ''رنگارنگ'' تبدیلی کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یقیناً اس پر بڑوں سے کہیں زیادہ بچوں کو خوشی ہو رہی ہوگی۔ آپ کا ''حرف آغاز'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنی سطروں میں اس پورے شمارے کا عطر بسائے ہوئے ہے۔ ''مقالات'' کے حصہ میں ''حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی متصوفانہ شاعری'' پر ڈاکٹر مختار علی کا اور سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی کی شاعری، علی الخصوص اس حکمراں شاعر کی غزل گوئی پر جناب ظہیر محمد کا مقالہ بہت ہی پسند آیا۔ بیشک یہ دونوں مقالے نہایت وقیع اور بصیرت افروز ہیں۔ دورانِ مطالعہ یہ بھی احساس ہوا کہ دکنی اردو کے متن کی کمپوزنگ اور تصحیح میں بیش از بیش صحت الفاظ واملا کا خیال رکھا گیا ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی اولیات کے بیان میں مقالہ نگار بہت کامیاب ہیں اور حضرت کی تعلیم کا خلاصہ بھی ایک جملہ میں سمٹ آیا ہے کہ نفس امارہ رزق حلال اور توبہ سے ہی نفس مطمئنہ میں ڈھل سکتا ہے۔ معانی کی شاعری پر لکھتے ہوئے جناب ظہیر محمد نے طلبا و طالبات کو نام کے تشابہ سے بچانے کی جو سعی کی ہے، وہ یقیناً بہت فائدہ مند ہے، بس یہ کہ محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں کے ساتھ ساتھ، دیگر اصناف میں بھی اس کی شاعری کا تھوڑا سا اور ذکر ہو جاتا تو بہتر تھا۔ غالب شناسی میں جناب محمد مستقیم کا اپنا ایک رنگ اور مزاج تھا، بلکہ اسے ان کا خاص وژن بھی کہہ سکتے ہیں، زیر نظر شمارے میں ان کے قلم سے ''غالب کی فارسی رباعیوں کا مستقبل'' بھی اسی رنگ کا غماز ہے جو بہرحال اپنے موضوع پر دعوتِ فکر و نظر ضرور دے رہا ہے۔ جناب رئیس الدین رئیس نے ''مجروح کی شاعری میں سیاسی اور انقلابی رمزیت'' کے حال واحوال بھی بخوبی دکھایا ہے۔ اس حصہ کے دیگر مقالے بھی معیاری ہیں۔ اکتوبر کا مہینہ باپو کا ماہِ ولادت ہے۔ اس لحاظ سے یہاں ''باپو: شعرو ادب میں'' کی شمولیت آپ کی صحافتی دیدہ وری پر گواہی دے رہی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ڈاکٹر نشاط اختر نے اپنے اس مقالہ میں موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ افسانوں کے حصہ میں پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کہانی بہ عنوان ''فبای آلاء ربکما تکذبٰن'' اور ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری کی کہانی ''سادگی میں سادھان'' نے خاص طور سے متوجہ کیا۔ نفسیاتی لحاظ سے سلیم سرفراز کا افسانہ ''تین مشت خاک'' اور افتخار عظیم چاند کا افسانہ ''گناہوں کا کفارہ'' بھی اچھی کاوش ہے، اس شمارے میں شاعری کا حصہ بھی ایک نہیں انیک لحاظ سے متاثر کر رہا ہے۔ کتابوں پر تبصرے بھی عمدہ اور بھرپور ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی ہر لحاظ سے مفید، معیاری اور حسب موقع تحریروں سے شاد و آباد ہے۔ دعا گو ہوں کہ اکادمی مجلّہ آپ کی ادارت میں اسی طرح اپنی پہچان مزید روشن کرتا رہے۔ آمین!

(ڈاکٹر) انجمن اختر، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ اکتوبر ۲۰۲۳ء اپنے نکھرے ہوئے رنگ روپ کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ اپنے صوری حسن و جمال کے ساتھ ساتھ یہ اپنی معنوی خوبیوں کا احساس دلانے میں بھی پوری طرح کامیاب ہے۔ ایک طرف آپ کے ''حرف آغاز'' میں بیان کی جامعیت ہے تو دوسری طرف ''مقالوں'' میں موضوعات کا بے پناہ تنوع۔ دکن کے اکابرین شعروادب، پھر شمال کے مرزا غالب، فراق و مجروح ہی نہیں، گنگوہ کے نیر قریشی اور بہار کے شمیم قاسمی پر بھی آپ نے یہاں نہایت اعلیٰ درجہ کی تحریریں یکجا کر دی ہیں اور اسی کے ساتھ مظفر حنفی کے افسانوں اور نسوانی کرداروں کی روشنی میں قمر رئیس کی ناول فہمی پر بھی ضروری نکات سے بھرپور مضامین کے مطالعہ کا موقع دیا ہے، اسی پر بس نہیں بلکہ یہاں اردو شعروادب میں باپو کے تذکرے سے بھی پڑھنے والوں کی ضیافت ہو رہی ہے۔ اس قدر محنت و محبت سے شمارے کو سنوارنے کے لئے پرخلوص مبارکباد لیجئے۔ شاعری، افسانے

اور کتابوں پر تبصرے بھی لائق مطالعہ ہیں اور اس حوالے سے سبھی قلمکار مبارک بادی کے مستحق۔ اگلے شمارے کی راہ دیکھتے ہوئے خدا حافظ!

احمد گلریز، مظفر پور

☆ اکتوبر ۲۰۲۳ء کا ''زبان وادب'' ملا۔ شکریہ! خوب، بہت خوب! بچوں کا حصہ تو آپ نے کمالِ محنت سے بنایا ہے پہلے اس حصہ کی نظموں کی بات کروں۔ جناب محمود اختر جلال پوری نے سچ مچ بہت پیاری نظم لکھی ہے ''میں بھی سوچوں تو بھی سوچ'' یہ تو کورس میں گائی جانے والی مزیدار نظم ہے جو پڑھنے لکھنے، آگے بڑھنے، سماج کو بنانے، خوش حالی لانے اور سچا اچھا انسان بننے کے بارے میں سبھوں کو مل جل کر سوچنے کی دعوت دے رہی ہے۔ بات بالکل ٹھیک ہے، آدمی اچھی سوچ بناتا ہے تب ہی اچھی ڈگر پر چلتا ہے اور کامیابی پاتا ہے۔ دوسری پیاری پیاری سی نصیحت بھری نظم جناب خالد رحیم کی ہے ''سچ کہنے کی عادت ڈالو'' بیشک راست گوئی میں راحت ہے۔ سچے لوگوں کا ساتھ دینا اور جھوٹ بولنے والوں سے دور بھاگنا ہی چاہئے۔ اس نظم کی زبان بھی بہت آسان ہے۔ نظم پڑھ کر حدیث شریف کا وہ واقعہ یاد آیا جسے مولانا نے جمعہ کے دن ایک بار اپنے خطبہ میں سنایا تھا کہ اللہ کے نبی نے ایک شخص سے صرف جھوٹ چھوڑ دینے کا وعدہ لیا اور اُس پر عمل سے اُس کے کردار کی کایا پلٹ گئی۔ اس بار ''بچوں کا زبان و ادب'' میں مضامین بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ بالکل ٹھیک! اکتوبر کا مہینہ تاریخ پیدائش کے حساب سے کئی رہنماؤں کی یاد ساتھ لاتا ہے اور اس تعلق سے محترمہ عائشہ رفعت کے مضمون میں اُن کے بچپن کی ذاتی یادیں بھی ہیں، کہانی کا لطف بھی ہے اور سوانح کی معلومات بھی۔ ''جب میں نے میزائیل مین کو دیکھا'' سچ مچ بہت اچھا مضمون ہے، انہیں میری طرف سے بہت بہت مبارکباد! جناب امتیاز احمد انصاری کا مضمون ''بینک کی باتیں'' بھی بہت سی کارآمد جانکاری دے گیا۔ لال بہادر شاستری پر محترمہ درخشاں جبیں صاحبہ نے بھی بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ اس سے شاستری جی کی زندگی، شخصیت اور اُن کے کارنامے کھل کر سامنے آجاتے ہیں، ان کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ پڑھائی کے لئے اُن کی لگن اور چاہت سے جڑے واقعات ہمارے لئے ''اہم اسباق'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''اداریہ'' میں آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک! ان دونوں رہنماؤں پر مضامین سے آراستہ اس بار کا ''بچوں زبان وادب'' خاص طور سے پسند آیا اور جیسا کہ میں نے پہلے ہی لکھا ہے، یہاں ''دیگر نگارشات'' بھی بہت عمدہ ہیں۔ جناب عامر حسن کا مضمون ''......کنبہ ڈوبا کیوں؟'' بھی ہمیں بڑی سیکھ دے رہا ہے کہ صرف کسی فارمولہ کی جانکاری سے بات نہیں بنتی ہے بلکہ کوئی فیصلہ لینے اور کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے، پوری بات جاننا، خوب اچھی طرح سوچنا، سمجھنا اور سیکھنا ضروری ہے۔ اتنے اچھے، رنگین اور خوبصورت ''زبان وادب'' سے دل خوش کر دینے کا ایک بار اور شکریہ!

ایم۔ ارفاق، بہار شریف

☆ ''زبان وادب'' ماہ ستمبر ۲۰۲۳ء دستیاب ہوا۔ اس ناچیز کو یاد رکھنے پر سپاس گزار ہوں۔ ورق گردانی کرتے ہی رنگین صفحات دیکھ کر بیحد مسرت وشادمانی ہوئی۔ آپ نے ماضی کی شاندار روایتوں کی یاد تازہ کردی۔ پیش نظر شمارے کی ظاہری آرائش وزیبائش آنکھوں کو خیرہ کررہی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ آپ اسے شب وروز خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ مقالات ومضامین اور دیگر تخلیقات سے بھی ندرت وتازگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ ''حرف آغاز'' کے بعد جن مقالوں کو شمولیت بخشی گئی ہے، وہ نوع بہ نوع ادبی گوشوں کا احاطہ کررہے ہیں۔ اس حصہ کا آغاز ''شین مظفر پوری کے افسانوں میں احتجاج'' سے ہوتا ہے۔ مقالہ نگار نے ان کے مختلف افسانوں کے تجزیاتی مطالعے کی روشنی میں نفس موضوع کی وضاحت کی ہے۔ بعض ناقدین نے شین صاحب کی بسیار نویسی اور اوسط درجے کے رسالوں میں تخلیقات کی اشاعت کو معیوب شمار کیا ہے، حالاں کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تخلیقات کا معیار ومنہاج کیا ہے۔ اس طرح کا مرحلہ ہر افسانہ نگار کے قلمی سفر میں آتا ہے۔ ڈاکٹر صابر علی سیوانی نے ازبکستان کے حوالے سے قمر رئیس کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیا ہے جو خاص مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ غیر ملکی زبان کی تخلیقات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا واقعی ایک بڑا علمی کارنامہ ہے۔ بلاشبہ یہ روشن کارنامہ ان کے لوح وقلم کی تمت میں آیا ہے جو لائق

ستائش ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لئے رہبر و رہنما ہے۔ ڈاکٹر محمد بشیرالدین نے ودیا ساگر آنند کی ہائیکو نگاری کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ مضمون نگار نے اس جاپانی صنف میں آنند کی خدمات کے ساتھ ان کے محاسن بھی جامع طریقے سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر محمد شارب نے بھی اکبر کی شاعری کے چند اہم پہلو کو نہایت خوش اسلوب اور متوازن انداز میں نبھایا ہے۔ امتیاز احمد دانش کا مقالہ ''عہد غالبؔ میں شہر آرہ کا ادبی و شعری منظر نامہ'' ایک دلچسپ اور معلوماتی مقالہ ہے۔ اس سے ایک خاص تاریخی عہد کے بہت سے حقائق سامنے آتے ہیں۔ شبانہ عشرت نے ''علیم اللہ حالی کی نظموں میں طلسماتی فضا کا انفراد'' ثابت کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ یہ کہنا روا ہے کہ ان کی کوشش بڑی حد تک ذہن و فکر کو اپیل کرنے میں کامیاب ہے۔ اسی طرح فاطمہ حق نے بھی مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے فکری و فنی اختصاص کو عمدگی سے مبرہن کیا ہے اور نازلہ رباب نے ابواللیث جاوید کو ایک فکشن نگار، ایک شاعر کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے جو بہت خوب ہے۔ ابواللیث جاوید ایک بہترین فنکار تھے، لیکن ہم کو بہت جلد داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی جدائی سے ادبی دنیا اب تک سوگوار ہے۔ اس مرتبہ تازہ شمارے میں دو افسانوں اور ایک انشائیہ کو جگہ دی گئی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ دونوں افسانوں کی کہانی دل و نظر کو کھینچنے میں سرخرو ہے۔ شراب نوشی صحت و زندگی کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ یہ انسان کو کس قدر ہلاکت کے غار میں ڈھکیلتی ہے یہ پہلے افسانہ ''ڈوبتا سورج'' میں شرماجی کے حوالے سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ شکیلہ نگار کا افسانہ ''سپرنانی'' بھی خوب ہے۔ اس میں آکاش کی ذات کے حوالے سے انسانی ہمدردی اور تقسیم اراضی کے ساتھ نیکیوں کا رجحان ملتا ہے۔ عظیم اقبال کا انشائیہ ''تصویر'' بھی بہت خوب ہے اور ظرافت کا حسین گلدستہ ہے۔ منظومات کا حصہ بھی لطف و کیف پر محیط ہے۔ آغاز حافظؔ کرناٹکی کی خوبصورت نعت سے ہوتا ہے اور چھ شعرا کی غزلوں کے بعد احمد نثار کی رباعیات پر منتہی ہوتا ہے۔ تمام غزلیں قدیم و جدید رجحانات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بطور خاص ڈاکٹر شہنازؔ فاطمی کی غزل میں شادؔ عظیم آبادی کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ کتابوں کی دنیا میں دو تبصرے شامل ہیں، ان میں محمد شوکت جمال کا تبصرہ خاص محنت و کاوش پر شاہد عدل ہے۔ ناصحؔ ناصری گنجوی کے مجموعہ ''کلام ناصحؔ'' پر رابعہ خاتون کا تبصرہ بھی معلوماتی اور لائق مطالعہ ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' ان کے فکر و شعور کے اعتبار سے بہت خوب ہے۔ اس کے علاوہ مختلف صفحات پر فیلرز کی اہمیت اپنی جگہ ہے جو علمی و ادبی لحاظ سے قارئین کی نظروں کو گرفتار کرنے میں سرخرو ہیں۔ دعا ہے کہ ماہنامہ ''زبان وادب'' ہمیشہ اصحاب علم وادب کی نگاہوں میں معتبر رہے۔

پیکرؔ رضوی، پٹنہ

☆ مجلّہ ''زبان و ادب'' ستمبر ۲۰۲۳ء نظر نواز ہوا۔ بہت بہت شکریہ! آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ذمہ داری سنبھالتے ہی اکادمی مجلّہ کو مزید نکھارنے اور سنوارنے میں آپ اپنی دلچسپی، محنت، لگن اور اردو نوازی کا مظاہرہ کر رہے ہیں جو یقیناً قابل تعریف ہے۔ مشمولات سے لے کر مجلّہ کا گیٹ اپ، ڈیزائن، ٹائٹل پیج، مختلف رنگوں کے Combination اور شروع کے چار اور آخر یعنی ''بچوں کا زبان وادب'' کے چار ورق اپنی خوبصورت، چمک، دلکشی اور صحت کے گواہ ہیں۔ کاغذ کی quality اور glazing بھی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ ''ترجمہ نگاری'' پر مقالہ فنی اور علمی نقطۂ نگاہ سے افادیت کا حامل ہے، امتیاز احمد دانش کا مقالہ ''عہد غالبؔ میں شہر آرہ کا ادبی و شعری منظر نامہ'' پسند آیا۔ اس کے علاوہ ''بچوں کا زبان وادب'' میں بطورِ خاص مضمون ''یوم اساتذہ کا پیغام'' بچوں کے لئے نہایت مفید، معلوماتی، اخلاقی اور سبق آموز ہے۔

شرف الہدیٰ، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' ماہ ستمبر ۲۰۲۳ء مل گیا ہے شکریہ! اس بار یہ تبدیلی لے کر رسالہ آیا ہے۔ ابتدا کے آٹھ صفحات اور آخر میں آٹھ صفحات رنگین کریز ڈ پیپر میں ہیں۔ میں عرصے سے رسالے کا قاری ہوں۔ عرصہ ہوا دسمبر ۲۰۱۴ء کا ''زبان وادب'' کا خصوصی شمارہ جو ظفر عدیمؔ پر شائع کیا گیا تھا اور ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل تھا، اس کے بھی سولہ پیج

بہترین رنگین اشاعت میں تھے۔ فی الحال تبدیلی اچھی لگی۔ موجودہ رسالہ ادبیت اور معلومات سے بھرپور ہے۔ ڈاکٹر احمد صغیر نے مرحوم شین مظفر پوری پر وقیع مضمون لکھا ہے جس میں افسانوی مجموعوں اور ایک ناولٹ کا تذکرہ اور کئی افسانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، لیکن ''قانون کی بستی'' پر کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ کہانی کی شکل میں ماہنامہ ''شمع'' میں مری نظر سے گزر چکا ہے، عنوان اس وقت یاد نہیں آرہا ہے۔ اس کہانی کو ضروری اجازت لے کر نام کی تبدیلی کے ساتھ ''قانون کی بستی'' عنوان سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بی۔اے۔ نصاب میں شامل کرلیا گیا۔ ''بیسویں صدی'' اور ''شمع'' جیسے رسالے اپنے وقت کے بے حد معیاری اور سرکولیشن میں رہنے والے رسالے تھے اور ان میں بڑے بڑے معتبر اور معیاری ادیبوں اور شاعروں کی تخالیق شائع ہوا کرتی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں رسائل کو غیر معیاری جرائد سے کیوں اور کیسے جوڑ دیا۔ ڈاکٹر صابر علی، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ اور ڈاکٹر محمد شارب کے مقالے اچھے اور سیر حاصل ہیں۔ فاطمہ حق صاحبہ نے مجتبٰی حسین پر تفصیلی مقالہ لکھا ہے۔ تمام غزلیں اور حافظ کرناٹکی کی نعت پاک معیاری ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی اپنی جگہ خوب ہے۔

صادق علی انصاری، سیتاپور

☆ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۲۳ء کا شمارہ موصول ہوا۔ شمارے میں اپنا مضمون دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ مضمون کی اشاعت اور حوصلہ افزائی کے لئے میں آپ کی بیحد شکر گزار ہوں۔ شکریہ نامے میں تاخیر کے لئے معافی چاہتی ہوں۔ اُن دنوں میرا امتحان چل رہا تھا، اس لئے میں بروقت آپ کا شکریہ ادا نہیں کرسکی۔ یہاں جناب حامد حسین ندوی نے ''حمد باری'' میں بڑے ہی آسان الفاظ میں خدائے تعالیٰ کی تعریف بیان کی ہے۔ عفت دل آرا خان صاحبہ کی تخلیق ''نیکی کا فرشتہ'' بھی مجھے کافی اچھی لگی، جس میں انہوں نے بڑے ہی اچھے سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کیسے ایک آدمی اپنے اصول اور کردار سے پہچانا جاتا ہے۔ اس طرح بینش فردوس کا مضمون ''کچھ بیان کشش ثقل کے نظریے کا'' بھی اچھا لگا۔ اس مضمون میں انہوں نے کافی معلوماتی باتیں بتانے کی کوشش کی ہے۔ محمد مصطفٰی غزالی کی نظم ''دعا برائے والدین'' بھی مجھے بہت پسند آئی۔ محمد توحید اختر کی تخلیق ''بابا ذرا دیکھئے تو'' بھی بہت اچھی ہے۔ اس میں انہوں نے جو بات کہی ہے وہ دل کو چھوگئی کہ ہم کیسے اپنے بڑوں کو ان کی غلطی بتا کر شرمندہ کئے بغیر ادب کے دائرے میں رہ کر ان کی اصلاح کرسکتے ہیں۔ اس کے بعد اگست ۲۰۲۳ء کا شمارہ بھی ملا اور اس میں بھی بچوں کا حصہ بے حد پسند آیا۔ اس میں جو مضامین، کہانیاں اور نظمیں شامل کی گئی ہیں انہیں پڑھنے کے بعد مجھے کافی کچھ سیکھنے کو ملا۔ تنویر اختر رومانی کی تخلیق ''بڑوں کا ادب'' بتا رہی ہے کہ ہمیں ہر حال میں اپنے بڑوں کا ادب کرنا چاہئے، چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی علاقے کے ہوں۔ نجم الزماں کا مضمون ''تحریک ریشمی رومال'' بھی بہت اچھا اور کافی معلوماتی ہے۔ اس طرح عاقب محمد کا مضمون ''ہم ہیں تو زمین ہے'' کافی عمدہ لگا، ساتھ ہی مجیب الرحمٰن بزمؔی کی نظم ''جشن آزادی'' اور مناظر حسین شاہیؔن کی نظم ''ماں'' بھی کافی اچھی لگی۔ علی عامر کا مضمون ''آزادی کی اہمیت اور اس کا پیغام'' بھی اچھا لگا۔ اس مضمون میں انہوں نے ہمیں آزادی کی اہمیت اور اس کے پیغام کو بڑے ہی اچھے انداز میں بتایا ہے، اسی طرح اختر شیرانی کی نظم ''اردو زباں ہماری'' بھی بے حد پسند آئی۔ میں دعا کرتی ہوں کہ ماہنامہ ''بچوں کا زبان وادب'' ہم بچوں کے لئے اس طرح ہر ماہ پابندی سے خوبصورت، معلوماتی، دلچسپ اور تربیتی چیزیں لے کر منظر عام پر آتا رہے۔ آمین!

ادیبہ حیات شفا، پٹنہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کردیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور بازپرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا
زبان وادب

☆	ایک بھول	حشمت کمال پاشا	۷۴
☆	کھیل کے اصول	ڈاکٹر نریش	۷۵
☆	علامہ اقبالؔ جب بہار آئے	محمد غفران	۷٦
☆	چاچا نہرو	پرویز اختر	۷۸
☆	نیند: ایک نعمت	عبدالرزاق دلؔ کھولاپوری	۷۹
☆	غزل	ڈاکٹر التفات امجدیؔ	۷۹
☆	پیاری امی، پیارے ابو	شاذیہ ترنم	۸۰

حشمت کمال پاشا

B-119, Nawab Wajid Ali Shah Road, P.o. Garden Reach, Kolkata - 700024

(Mob. 9123998344)

ایک بھول

آؤ بچو! آج تمہیں چاچا نہرو کے بچپن کی کہانی ان ہی کی زبانی سناتا ہوں۔ وہ اپنے بچپن کی باتیں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بچپن کی باتیں بہت ہی پرانی ہوگئی ہیں، صاف یاد نہیں آتیں اور پھر یہ فیصلہ کرنا اور بھی مشکل ہے کہ بچپن ختم کہاں پر ہوتا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے بچپن کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے۔ اس بات کا یقین مجھے اس وقت اور بھی پکا ہو جاتا ہے، جب میں بچوں کے درمیان ہنستا کھیلتا ہوں اور خود بھی بچہ بن جاتا ہوں۔

آگے وہ لکھتے ہیں کہ شام کو والد سے ملنے کے لئے والد کے دوست ہمارے گھر آجاتے تھے، تو سارا گھر قہقہوں سے گونج اُٹھتا تھا۔ بعض اوقات میں پردے کے پیچھے سے جھانک کر والد اور ان کے دوستوں کو دیکھتا اور اس سوچ میں رہتا تھا کہ یہ بڑے لوگ آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میں پکڑ کر باہر لایا جاتا تھا۔ والد مجھے کچھ دیر اپنے گھٹنوں پر بیٹھا لیتے تھے اور میں ڈرا سہا بیٹھا رہتا تھا۔ ایک بار میں نے اپنے والد کو سرخ چیز پیتے ہوئے دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں نے دوڑ کر ماں سے کہا:

''ابا جی خون پی رہے ہیں۔''

چاچا نہرو مزید لکھتے ہیں کہ بچپن کی جو باتیں یاد ہیں ان میں والد کا وہ غصہ بھی ہے جو مجھ پر نازل ہوا تھا۔ ان دنوں میں کوئی پانچ یا چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی میز پر دو خوبصورت فاؤنٹین پین رکھے ہوئے تھے۔ دیکھ کر میرا دل للچا گیا، میں نے سوچا کہ پتا جی دو قلموں کا کیا کریں گے۔ لکھنے کے لئے ایک قلم ہی کافی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ایک قلم اٹھا لیا اور قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔ جب موتی لعل جی کورٹ سے واپس گھر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ میز پر صرف ایک قلم پڑا ہوا ہے اور دوسرا قلم غائب۔ انہوں نے چیخ کر کہا:

''میرا قلم کس نے اٹھایا ہے۔''

دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں بھونچال آ گیا۔ گھر کے ہر فرد سے پوچھ گچھ کی گئی۔ یکے بعد دیگرے ہر ایک نے کہا کہ ہم لوگوں نے قلم نہیں اٹھایا ہے، آخر کار جب میری باری آئی تو میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ:

''میں نے قلم نہیں اٹھایا؟ میں نے قلم کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''اگر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تو قلم کیا ہوا؟''

بڑے سرکار زور سے گرجے اور غصہ سے کہا:

''تب یقیناً کسی نے جھوٹ بولا ہے، ورنہ قلم کیا ہوا؟''

قلم کس نے لیا ہے؟ یہ ایک سوال تھا؟ جسے جاننے کے لئے زور و شور سے تلاشی کی مہم جاری رہی، مگر لا حاصل یعنی تلاش بسیار کے بعد جب قلم نہیں ملا تو بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک دن...... دو دن...... تیسرے دن بڑے سرکار کی آواز گونجی:

''منشی جی......!''

''جی سرکار'' منشی جی دوڑے دوڑے ہانپتے کانپتے جب آئے تو موتی لعل جی نے کہا: ''دیکھئے پنڈت جی ہم کب سے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور جواہر کا کہیں پتہ نہیں ہے۔''

''ابھی تو یہیں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔''

منشی جی نے ہکلاتے ہوئے کہا:

''آپ اس کی بے جا حمایت کر کے اس کے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہیں۔''

منشی مبارک علی دوڑے دوڑے باہر آئے اور جواہر سے کہا:

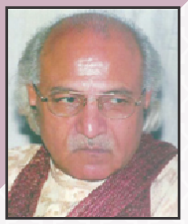

ڈاکٹر نریش
169, Sector - 17, Panchkola - 134109

کھیل کے اصول

بچو کھیلو ایسے کھیل — جن سے بڑھے آپس میں میل
کسی سے پنگا مت لینا — کسی کو ٹنگری مت دینا
کسی سے جھگڑا مت کرنا — روندو کبھی نہیں بننا
خوش اخلاقی یاد رہے — ہر ساتھی دلشاد رہے
کسی کا کوئی مذہب ہو — اپنے سا اس کو سمجھو
ذات پات سے رہنا دور — ساتھی کوئی نہ ہو رنجور
دوست بناؤ کھیلوں میں — تا حیات جو ساتھ رہیں

❁❁❁

''چھوٹے سرکار جلدی چلئے ورنہ آپ کے ساتھ ساتھ میری بھی خیر نہیں۔''

والد صاحب کے غصہ سے جواہر کو بڑا ڈر لگتا تھا۔ جواہر جلدی جلدی تیار ہو کر کمرے میں پہنچے تو والد صاحب کے ساتھ ساتھ پنڈت جی بھی موجود تھے۔ جواہر نے کانپتے ہوئے گھبراہٹ اور ڈر کے مارے پنڈت جی کے سامنے اپنا بستہ کھولا۔ بستہ کھول کر کتابیں نکال ہی رہے تھے کہ اچانک کتاب کے بیچ سے ایک قلم گرا۔

''اچھا تو یہ قلم تمہارے پاس تھا۔''

''جی......!'' جواہر چونکا۔

''قلم لے کر اِدھر آؤ'' موتی لعل جی گرجے: ''آج کئی دنوں سے میں اس قلم کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے تم سے بھی کئی بار پوچھا! لیکن تم نے ہمیشہ یہی کہا کہ مجھے نہیں معلوم؟ میں نے قلم نہیں اٹھایا۔''

اب مجرم پکڑا گیا۔ چار و نا چار اسے اقرار کرنا پڑا کہ قلم اس نے ہی اٹھایا تھا۔ اس کے جھوٹ کو دیکھ کر اس کے والد مارے غصہ کے آگ بگولا ہو گئے:

''تم ایک کامیاب وکیل کے بیٹے ہو شرم نہیں آئی جھوٹ بولتے ہوئے۔'' پھر بڑے سرکار نے کئی طمانچے یکے بعد دیگرے لگائے۔ جواہر کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا اور والد اس قدر خفا ہوئے کہ میری خوب مرمت کی۔ میں درد کی تکلیف سے اور ذلت کے رنج سے بیتاب روتا ہوا ماں کے پاس پہنچا۔ ماں نے مجھے فوراً گود میں اٹھا لیا اور میرے چھوٹے سے دکھتے ہوئے جسم پر کئی روز تک طرح طرح کے روغنوں کی مالش کرتی رہیں۔ غالباً میرا خیال تھا کہ سزا تھی تو بالکل بجا، مگر حد سے زیادہ ہو گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر ذلت کے احساس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ یہ سزا پنڈت جی کے سامنے ملی تھی، لیکن باوجود اس کے میرے دل میں ان کی عظمت اور محبت قائم رہی۔ اب میں ان سے بیحد ڈرنے لگا تھا۔

سوچو بچو! اگر جواہر کی گوشمالی نہیں ہوتی جو بالکل صحیح وقت پر ہوئی تھی تو ہمارے مہان دیش ہندوستان کے وزیر اعظم کیسے ہوتے۔

۱۴ نومبر نہرو چاچا کا جنم دن ہے۔ چاچا نے اپنا جنم دن ہم بچوں کے نام کر دیا ہے۔ آؤ ہم سب مل کر ان کو خراج عقیدت پیش کریں اور چاچا نہرو نے ہم بچوں سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں ہم اس پر چل کر سچ ثابت کر دکھائیں۔ ❁❁

محمد غفران
New Azimabad Colony, Patna - 800006

علامہ اقبال جب بہار آئے

''میں ایک طویل سفر کے بعد پرسوں لاہور آیا ہوں۔ایک مقدمہ کے سلسلہ میں آرہ (صوبہ بہار) گیا ہوا تھا۔''

پیارے بچو! یہ سطریں اُس خط سے لی گئی ہیں جس پر ۹ر مارچ ۱۹۲۰ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ تو تم سب سمجھ ہی گئے ہوگے کہ یہ خط کہاں سے لکھا گیا ہے۔اس کے مکتوب الیہ خان محمد نیاز الدین خاں ہیں اور اس خط کو لکھنے والے کوئی اور نہیں بلکہ شاعر مشرق علامہ اقبال ہیں جن کی نظم ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ہم لوگ بچپن سے سنتے اور پڑھتے آرہے ہیں۔ ''ترانۂ ہندی'' کے عنوان سے یہ نظم علامہ اقبال نے ۱۰ر اگست ۱۹۰۴ء کو لکھی تھی۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں اقبال کے جس خط سے بات شروع ہوئی ہے، وہ اس نظم کے تقریباً دس سال بعد کا ہے یا یوں کہیں کہ اقبال جب بہار آئے تھے تو وہ ''ترانہ ہندی'' والے اقبال تھے۔

عبداللہ انور بیگ نے ایک جگہ اقبال کے سفر پٹنہ کا ذکر کیا ہے، مگر گمان کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ یہ دو الگ الگ سفر نہیں بلکہ ایک ہی سفر ہے اور شاید وہی سفر جس کا ذکر خط میں ہوا ہے۔ بہر حال ہمارے لئے یہ بات کچھ کم فخر کی نہیں کہ علامہ اقبال بہار آئے تھے۔اقبال کے اس سفر کی تفصیل تو دستیاب نہیں ہوتی، مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پٹنہ (آرہ) سے واپسی میں انہوں نے الہ آباد میں اکبرالہ آبادی کے یہاں چندروز قیام کیا تھا۔

عزیز بچو! جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں علامہ سر محمد اقبال ایک شاعر ہی نہیں ایک جانے مانے ہوئے بیرسٹر بھی تھے۔وکالت کی دنیا میں اُن کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو جب اُن کا انتقال ہوا تھا تو ان کے جنازے میں پنجاب کے چیف سکریٹری، قائم مقام چیف جسٹس اور جج صاحبان شریک ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ لاہور ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس کی

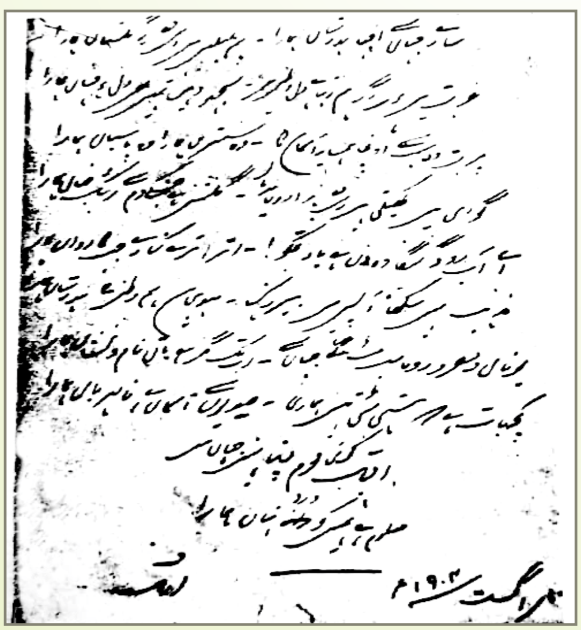

صدارت میں ایک بڑا تعزیتی جلسہ بھی ہوا تھا۔ بہر حال یہاں اصل میں بتانا یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کا یہ سفر ایک شاعر یا ادیب کے طور پر نہیں، بلکہ ایک وکیل کے طور پر تھا۔ وہ پٹنہ کی عدالت میں چل رہے، اُس مقدمہ کے سلسلے میں آئے تھے جو ''ڈمراؤں راج کیس'' کے نام سے مشہور ہے۔

اس مقدمہ میں ایک لفظ پر تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور عدالتی دستاویز میں اُسے پڑھنے کے لئے علامہ اقبالؔ کی خدمات لی گئی تھیں۔ اس مقدمہ میں ایک طرف سی آر داس وکیل تھے اور دوسری طرف موتی لال نہرو، پھر ڈاکٹر عبداللہ سہروردی اور کئی دوسرے بڑے بڑے وکلا بھی ان دونوں کی اعانت کے لئے مقرر تھے۔ سی آر داس حکومت کی طرف سے مقدمہ لڑ رہے تھے اور انہوں نے ہی حکومت کی اجازت سے اقبالؔ کو لاہور سے بلوایا تھا۔ عدالت نے اس مقدمہ کے لئے اقبالؔ کو ایک ہزار روپے روزانہ اور اُن کے کلرک (منشی) کو دوسو روپے روزانہ دینا منظور کیا تھا۔ اقبالؔ کو یہاں ایک دو مہینے یا جتنی مدت چاہیں، ٹھہرنے کی اجازت تھی اور مقدمہ کی ضرورت کے لئے، کتابیں یا حوالے دیکھنے کی خاطر، حکومت کے پورے خرچ پر لاہور یا کلکتہ جانے آنے کی بھی اجازت تھی، لیکن اقبالؔ نے دو ایک دن ہی پٹنہ میں قیام کیا۔

اقبالؔ پٹنہ پہنچے تھے تو سی آر داس انہیں لینے کے لئے اسٹیشن آئے تھے۔ دوسرے دن سی آر داس کی اقبالؔ سے ملاقات نہ ہوسکی اور جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے، اگلی صبح جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے سی آر داس کو بتایا کہ وہ مقدمہ کے سارے کاغذات تیار کر چکے ہیں اور فوراً ہی اپنا نقطہ نظر عدالت میں پیش کر کے لاہور لوٹنا چاہتے ہیں۔ انہیں سہولیات اور مالی فائدے کی بات بیرسٹر داس نے بتائی اور کہا کہ اس قدر جلد اپنی رائے دینا کچھ ضروری نہیں۔ وہ اطمینان سے کام کریں، مگر اقبالؔ راضی نہیں ہوئے اور اگلے دن انہوں نے اپنا بیان عدالت کے سپرد کر دیا اور لاہور واپسی کے لئے تیار ہو گئے۔

اتفاق کی بات کہ اس وقت تک بینک بند ہو چکے تھے اور عمال حکومت کے پاس فیس دینے کو رقم موجود نہ تھی۔ اقبالؔ ایک دن اور رُک جاتے تو انہیں ایک ہزار روپیہ اور مل جاتا، لیکن انہوں نے واپسی پر اصرار کیا، یہاں تک کہ بروقت روپیہ جمع کر کے فیس ادا کر دی گئی اور اقبالؔ پہلی ٹرین سے لاہور روانہ ہو گئے۔

پیارے بچو! کہنے کو اقبالؔ کے سفر بہار کی یہ مختصر کہانی ہے، مگر اس سے ہمیں زندگی کے کئی بڑے سبق ملتے ہیں۔ اپنے فیصلہ پر اعتماد اور اطمینان قلبی کا سبق، غیر ضروری اخراجات سے بچنے بچانے کا سبق، کسی کی طرف سے ملی ہوئی سہولیات سے بلاوجہ فائدہ نہ اٹھانے کا سبق اور سب سے بڑھ کر کسی طرح کی لالچ میں نہ پڑنے اور قناعت کی راہ پر چلنے کا سبق۔ سچ ہے بڑے قلم کار اپنے کردار میں بھی ہمیشہ بڑے ہی رہتے ہیں۔ (جگن ناتھ آزاد کے مضمون ''اقبالؔ کا سفر بہار'' ہفتہ وار عظیم آباد ایکسپریس، پٹنہ ۱۳ نومبر ۱۹۷۷ء، ص ۶ اور پندرہ روزہ ''بخشیات'' کلکتہ یکم دسمبر ۱۹۷۷ء، نیز روزنامہ The Statesman، کلکتہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع شدہ رپورٹ کے اردو ترجمہ سے اخذ و استفادہ) ❁❁

خودداری کیا ہے؟

پیارے بچو! خودداری ایک اعلیٰ اخلاقی وصف کا نام ہے یعنی اپنے آپ کو لغو حرکتوں اور فضول باتوں سے محفوظ رکھنا، اپنی عزت نفس کا خیال رکھنا اور ضبط و تحمل سے کام لینا۔ اسی لئے خودداری کو بزرگوں نے عین شرافت کہا ہے۔ جس شخص میں خودداری کا وصف نہیں ہوتا، اُس میں نہ تو فکر و نظر کی بلندی ہوتی ہے، نہ ہی خیال کی عظمت و رفعت اور اخلاق و مروت کی شان و شوکت، یہاں تک کہ ایسے شخص کی نہ تو دوسروں کی نگاہ میں کوئی عزت رہ جاتی ہے اور نہ ہی اس کی باتوں میں کہیں کوئی وزن اور لحاظ رہتا ہے۔ خودداری یہ ہے کہ ہماری چال ڈھال، ہماری بات چیت، رہن سہن غرض کہ ہر چیز سے شرافت اور سنجیدگی کا اظہار ہو، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس میں غرور کا کوئی شائبہ نہ آنے پائے، کیوں کہ غرور و تکبر اصل میں حق کے انکار کا نام ہے اور اس وطیرے کا نام کہ لوگوں کو بلاوجہ اپنے سے ذلیل، کمتر اور حقیر سمجھا جائے۔ غیرت و خودداری اور عزت نفس کی پہچان وقار یعنی سنجیدگی اور حلم و بردباری سے ہوتی ہے۔ غربت اور تنگدستی کا دور غیرت اور خودداری کی حفاظت کے امتحان کا دور ہوتا ہے۔ ایسے دور میں ہر ایک سے مدد مانگنے اور دست سوال پھیلانے سے بچنا چاہئے۔ (ماخوذ)

پرویز اختر
Pathar Ki Masjid, Patna - 800006

چاچا نہرو

پیارے بچو! یہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ نومبر کا مہینہ پنڈت جواہر لال نہرو کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ وہ بچوں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے، لہٰذا ان کی تاریخ ولادت یعنی ۱۴ نومبر کو ''یومِ اطفال'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔

ہندوستان کے ان عظیم رہنماؤں میں جنہوں نے ملک کی آزادی کے لئے مسلسل و بے پناہ جد جہد کی، پنڈت جواہر لال نہرو کا نام یقیناً بہت اہمیت کا حامل ہے۔

پنڈت جی کا بچپن بہت خاص تھا۔ ان کے بچپن کی ایسی ایسی کہانیاں موجود ہیں کہ انہیں جان کر تم حیران رہ جاؤ گے۔

ایک بار جب چاچا نہرو اپنے جوتے پالش کر رہے تھے تو ان سے کسی نے کہا کہ یہ کام تو نوکر بھی کر سکتے ہیں۔ نہرو جی نے کہا: ''یہ ٹھیک ہے، مگر ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے ہی آدمی اپنے آپ پر بھروسہ اور انحصار کرنے والا بنتا ہے۔ اس واقعہ سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ کام چھوٹا ہو یا بڑا ہر بچے کو اپنا کام خود ہی کرنا چاہئے۔

ایک بار ایک پروگرام میں شرکت کے لئے چاچا نہرو گئے تھے۔ وہاں ایک بچے نے اپنی آٹوگراف بک ان کو دی اور درخواست کیا کہ اس پر آپ Sign کر دیں۔ چاچا نہرو نے آٹوگراف دے کر

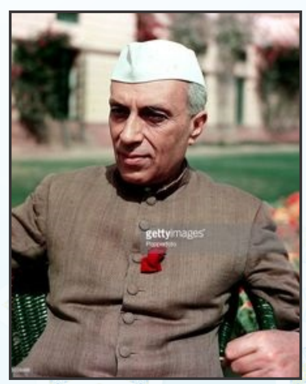

کتاب واپس کر دیا۔ بچے نے اس آٹوگراف کو دیکھا، اس پر تاریخ نہیں تھی۔ اس نے چاچا نہرو سے کہا کہ آپ نے آٹوگراف دیا ہے، لیکن اس میں تاریخ نہیں لکھی ہے۔ چاچا نہرو نے بچے سے آٹوگراف کی کتاب لی اور تاریخ لکھ کر واپس کر دی۔ اس بار بچہ اپنی کتاب پر آٹوگراف اور اس کے ساتھ لکھی تاریخ دے کر بولا:

''آپ نے اردو نمبروں میں تاریخ دی ہے۔''

اس پر چاچا نہرو نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ نے پہلے مجھ سے انگریزی میں "Sign" کرنے کو کہا تو میں نے انگلش میں سائن کیا اور پھر آپ نے مجھے اردو میں ''تاریخ'' لکھنے کو کہا تو میں نے اردو میں تاریخ لکھ دی۔ چاچا نہرو کا جواب سن کر وہاں موجود سبھی لوگ ہنس پڑے۔

اس واقعہ کے ساتھ چاچا نہرو نے گویا اس بچے کو مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر امتیاز نہ کرنے کی تعلیم دی، چاچا نہرو ہمیشہ کہتے تھے

کہ مذہب مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن ہم ہندوستانی ایک ہیں۔ انہوں نے بڑوں اور خصوصاً بچوں کو نصیحت کی کہ بحران اور تعطل ہمیں زندگی میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، جدوجہد کے بغیر کوئی کامیابی ممکن نہیں۔ بحران اور مصیبتیں ہمیں مستقبل میں اچھے اور برے کا راستہ دکھاتی ہیں۔ درد بھی ہمیں بہت سے سبق سکھاتا ہے۔ جیت میں خوشی ہے، لیکن ہار میں بھی سیکھ ہے۔ پنڈت نہرو نے بتایا کہا گر تمہاری دونوں آنکھیں سلامت ہوں، تب بھی ایک آنکھ والے کو دیکھ کر تم کبھی نہ ہنسو، ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آنکھ والا تم سے زیادہ صاحب نظر یعنی عقل منداور ہوشیار ہو۔ چاچا نہرو نے یہ بھی نصیحت کی ہے کہ دوسروں کی خامیاں اور کمزوریاں تلاش کرنے سے پہلے ہم اپنی خامیاں اور کمزوریاں تلاش کر لیں۔ بلند انسانوں کی پہچان یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اُن سے کچھ مانگے تو وہ منھ سے کچھ کہنے کے بجائے کام پورا کر دینے کے بعد ہی اُس کا جواب دیتے ہیں۔ ہر وہ کام دھرم ہے جس کا انجام اچھا اور دلوں کو سکون دینے والا ہو۔

عبدالرزاق دلؔ کھولاپوری

At. Post- Kholapur, Ta. Bhatkuli, Dist- Amravati-444802
(Maharastra) (Mob. 7304485318)

نیند: ایک نعمت

نیند بچو! عظیم نعمت ہے
اور ہر ایک کی ضرورت ہے

نیند بچپن کی لوریوں کا عمل
نیند دن بھر کے کام کاج کا پھل

نیند قدرت کا قیمتی تحفہ
نیند ہر جاندار کا حصہ

بچو! سپنوں کا ہے خزانہ نیند
تندرستی کا ہے ٹھکانا نیند

نیند نہ آنا عارضہ کا ہے نام
جس سے بگڑے ہے ہاضمے کا نظام

نیند کم ہو تو یاد داشت گھٹے
کروٹیں لیتے ہوئے رات کٹے

پر سکوں نیند سے توانائی
جس سے دانش بڑھے اور دانائی

جینا دشوار ہو نہ نیند بنا
دلؔ نہ ہو بیقرار نیند بنا

ڈاکٹر التفات امجدیؔ

Khanquah Amjadia, Station Road, Siwan - 841226
(Bihar) (Mob. 9934497795)

غزل

گیلا آٹا بیل رہے ہیں
بازو سختی جھیل رہے ہیں

بچے کرکٹ بھول کے پب جی
موبائل پر کھیل رہے ہیں

لالہ جی کی خاطر ہم سب
پنکچر موٹر ٹھیل رہے ہیں

اونچے درجے میں کیا جائیں
دو برسوں تک فیل رہے ہیں

سی سی کرتے تھے بچپن میں
برسوں تک ہم ریل رہے ہیں

بازو میں پھرتی لانی ہے
ڈنڈ کھلاڑی پیل رہے ہیں

گھر میں اُجالا پھیلانے کو
ہم دیپک کا تیل رہے ہیں

امجدیؔ چھوٹے سے دل پر بھی
کتنے دکھ ہم جھیل رہے ہیں

شاذیہ ترنم
Jandaha House, Gulshan Colony, Mahendru, Patna - 800006 (Mob. 9110987472)

پیاری امی، پیارے ابو

''امی......! پیاری امی......''

''ابو......! پیارے ابو......''

آپ نے یہ الفاظ سنے ہوں گے، انہیں بولتے بھی ہوں گے، کتابوں میں پڑھتے بھی ہوں گے۔ بیشک ''امی'' اور ''ابوّ'' زبان سے نکلتے ہی ہمارے دل و دماغ میں ایک حسین جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دیکھنے میں تو یہ چند حرفوں پر مشتمل الفاظ ہیں، مگر ایسا لگتا ہے جیسے اپنے اندر ساری کائنات سمیٹے ہوئے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ امی اور ابو کا وجود کتنی بڑی نعمت ہے، اس کا حال جاننا ہو تو اپنے اُن ساتھیوں سے پوچھئے جو اس نعمت سے محروم ہو چکے ہیں، جن کے سر سے ابو کا سایہ اٹھ گیا ہے یا جو اپنی امی کی پیار بھری گود ہمیشہ کے لئے کھو چکے ہیں۔

جب انسان اس دنیا میں آتا ہے، خدا اسے بہت سے رشتوں سے نوازتا ہے۔ ان رشتوں میں سب سے اول رشتہ ماں کا ہوتا ہے۔ اُس وقت جب ہم خود دنیا میں آئے ہوئے بھی نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہمیں کسی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، صرف اور صرف ماں ہوتی ہے، جو ہمارے جذبات کو محسوس کرتی ہے۔

ذرا سوچ کر دیکھئے، کیا اس رشتہ سے اہم رشتہ ایک انسان کے لئے کوئی اور ہوسکتا ہے؟ اگر آپ کا جواب ہاں ہے، تو پھر یہ بھی سوچئے کہ آپ اپنی امی کی باتیں کیوں نہیں مانتے۔ اپنے ابو کی نصیحت پر عمل سے کیوں دور بھاگتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ سے پیاری امی پیارے ابو کے رشتہ کو سمجھنے میں کہیں، کوئی کمی ہو رہی ہے۔

اس دنیا میں آرام بھی ہے تکلیف بھی۔ آرام میں آپ غلط فائدے کی طرف جاسکتے ہیں۔ تکلیفیں بھی آپ اکیلے برداشت نہیں کرسکتے، اس لئے اللہ نے ماں باپ کی عظیم نعمت سے نوازا جو آپ کو آرام و راحت پہنچاتے اور اس کا صحیح مصرف بھی بتاتے ہیں۔ جب کوئی مشکل اور مصیبت آتی ہے تو خود اُس کا مقابلہ کرتے ہیں اور کسی غم کا سایہ بھی آپ تک پہنچنے نہیں دیتے۔

یہ صرف ماں باپ ہی کا رشتہ ہے کہ آپ بھلے ان کو تکلیف دیں، اُن کی باتیں نہ مانیں اور انہیں پریشان کریں، لیکن بدلے میں آپ کو ان سے صرف پیار ہی پیار اور دعا ہی دعا ملتی ہے۔

آپ رشتے کی خوبصورتی، اس کی اہمیت اور اس کے حقوق کو سمجھیں۔ زندگی کا ہر پل اور ہر پن غنیمت ہے۔ آپ ہمیشہ اپنے ماں باپ کی خدمت کریں، ان کی عزت کریں اور پیار سے ان سے باتیں کریں۔ اگر چوبیس گھنٹے میں نصف گھنٹہ آپ اپنے والدین کے ساتھ گزارتے ہیں تو یقین جانیں ان کی دعائیں آپ کو دنیا اور آخرت دونوں جگہ کامیاب بنادیں گی۔ یہ تو آپ نے بار بار سنا ہی ہوگا کہ اللہ تعالی نے ماں باپ کو جھڑکنا کیا، ان کے مقابلے میں ''اُف'' کہنے سے بھی منع کیا ہے۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے تو باپ کو جنت کا دروازہ کہا گیا ہے، پھر ہم سب اپنی دنیا اور اپنا دین بنانے کے لئے اپنی امی اور اپنے ابو کی باتوں پر عمل کیوں نہ کریں۔

یہ ٹھیک ہے کہ آج کا ماحول بگڑا ہوا ہے۔ ماں باپ سے بحث کرنا، ان کو جھڑک کر جواب دینا، ان کی نافرمانی کرنا، اپنی جائز اور ناجائز خواہشات پوری کرانا اور انہیں طرح طرح سے تکلیف دینا، اُن کی بات اُٹھا دینا اس دور کا ایسا عام چلن ہے کہ اب اس کی آفت کا احساس بھی نہیں ہوتا، لیکن ہمیں ایسے ساتھیوں سے ہمیشہ بچنا ضروری ہے جو زبان سے ''پیاری امی''، ''پیارے ابوّ'' کہا کرتے ہوں، مگر والدین کی قدر نہیں کرتے ہوں۔ انہیں دکھی رکھتے ہوں اور اُن کی باتیں ٹھکرا دیتے ہوں۔ ہمارا دین، ہمیں والدین کی فرماں برداری سکھاتا ہے اور اسی پر عمل کرنے میں ہمارا بھلا ہے۔ ❁❁

حمیدؔ عظیم آبادی

غزل

آؤ پھر تذکرۂ صحبتِ رندانہ کریں
آؤ پھر بیٹھ کے ذکرِ مئے و میخانہ کریں

ہر نفس بادۂ سرجوش سے اٹھیں شعلے
آؤ تجدیدِ ضیا پاشئ پیمانہ کریں

آئے کانوں میں وہی قُلقلِ مینا کی صدا
پھر اسی جوش سے ہم نعرۂ مستانہ کریں

قصۂ کہنہ میں کچھ جدّت ترمیم بھی ہو
اس طرح یاد وہ بھولا ہوا افسانہ کریں

خوبئ نظم بھی ہو، جدّتِ تخئیل بھی ہو
شوخ کچھ اور ذرا رنگ قدیمانہ کریں

اگلی صحبت کا سماں آنکھوں میں کھینچ جائے حمیدؔ
آؤ پھر تذکرۂ بادہ و پیمانہ کریں

عبدالحمید حمیدؔ عظیم آبادی ابن سید یوسف حسین، حضرت شادؔ عظیم آبادی کے اجل تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انہیں ۲۵ مارچ ۱۹۱۵ء کو شادؔ سے شرف تلمذ کے بعد اگرچہ محض بارہ سال ہی استفادہ کا موقع ملا، مگر اپنے استاد سے ان کی یہ مثالی محبت تھی کہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۶۲ء کے درمیان انہوں نے شادؔ کی متعدد کتابیں شائع کیں۔ اس کے علاوہ راسخؔ اور بیتابؔ کے مجموعے بھی طبع کرائے۔ حمیدؔ عظیم آبادی کی ادبی زندگی کا آغاز مبارکؔ عظیم آبادی کی شاگردی کے ساتھ ۱۹۱۳ء سے ہوا اور پھر تا دمِ آخر وہ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ وہ نہ صرف ایک شاعر بلکہ بڑے عروضی اور عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ مجموعہ غزل ''سروش میکدہ'' کے علاوہ علم عروض میں ان کی کئی کتابیں یادگار ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں ترک وطن کے بعد انہوں نے سکھر سندھ میں ''مجلس ادب'' قائم کیا اور وہاں سے ''جام جم'' نامی رسالہ بھی نکالا۔ حمیدؔ عظیم آبادی نے بقلم خویش اگرچہ صرف اپنا سال ولادت ۱۸۹۷ء بتایا ہے، لیکن تذکرہ ''مسلم شعرائے بہار'' جلد اوّل میں درج ہے کہ وہ ۱۸ فروری ۱۸۹۶ء کو اپنے آبائی مکان واقع لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ ترک وطن کے بعد ۲۹ ستمبر ۱۹۶۳ء کو احباب و اعزہ سے ملاقات کے لئے وہ پٹنہ آئے تھے اور یہیں چند روزہ علالت کے بعد ۶ رنومبر ۱۹۶۳ء کو ان کا انتقال ہوا اور ۷ رنومبر کو پکی درگاہ جھٹلی، پٹنہ سیٹی میں مدفون ہوئے۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2023

Volume : 44 | November - 2023 | No. 11

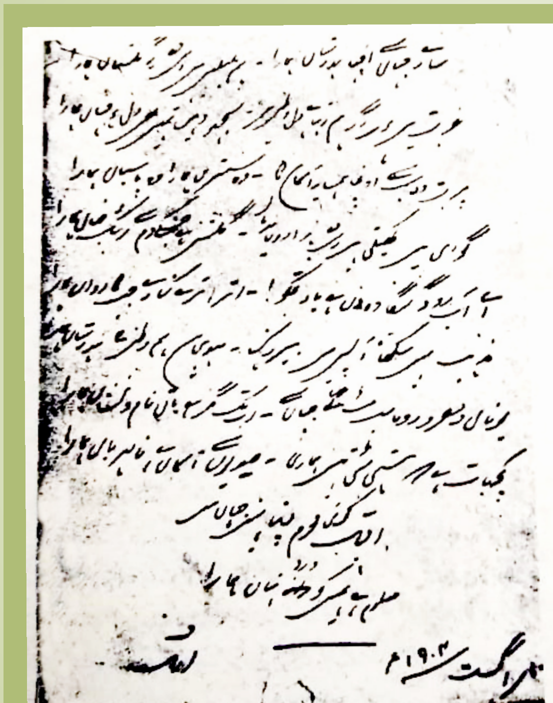

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں

طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15